76

اردو مثنوی
ایک مطالعہ

ساحل احمد



اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد



اردو مثنوی ایک مطالعہ

ساحل احمد

اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

کتاب : اردو مثنوی ایک مطالعہ

مصنف : ساحل احمد

اشاعت : ۱۹۹۸

طباعت : تاج آفسٹ۔ الہ آباد

کتابت : ذکی احسن

قیمت : 16/-

ناشر : اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

رابطہ : لٹریری بک سنٹر ۱۲۶ چک الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

دو باتیں

لٹل بک سیریز کے
تحت طلباء وطالبات
کی نصابی ضرورتوں کو
ملحوظ رکھتے ہوئے ارزاں
قیمتوں اور کم صفحات
کی کتابیں شائع کی گئیں

اور آئندہ بھی اسی سلسلۂ مفید
کو جاری رکھنے کی سعی کی جائے گی۔

آپ سب خیرخواہان
اردو سے توقع ہے کہ گلڈ کے
اشاعتی سلسلے کو رواں دواں
رکھنے میں تعاون کریں گے۔
فہرست کتب طلب کریں
اور دور و نزدیک تک انہیں
پہنچانے کی زحمت قبول کریں
اور کتابوں کی خریداری کے
ضمن میں اپنا ہر ممکنہ تعاون
دے کر اشاعتی سلسلے کو رواں
دواں رکھنے میں اعانت
فرمائیں۔

ساحل احمد

۲۸ جولائی ۱۹۹۸ء

اردو مثنوی ایک مطالعہ

(۱)

مثنوی لفظ مثنیٰ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ۲-۲ کے ہیں۔ ہر شعر کے قوافی الگ الگ متعین کیے گئے ہیں۔ اسے بہ طور ہیئت "ابیات مختلف القوافی" کہہ سکتے ہیں۔ شروع تا آخر وزن مساوی ہی رہتا ہے اور نہ کوئی تعداد ہی متعین کی گئی ہے۔ بہ اعتبار اصل یہ عربی لفظ ہے اور اسم مؤنث ہے اور اصلاً فارسی صنف ہے۔ عربی میں مروّج ہوئی تو اسے "مزدوجہ" (مزدوج) کے ایک اور نئے نام سے موسوم کیا گیا۔

یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں نظم و نثر کی بنیادی خصوصیات کا عکس اور نقش دونوں مساویانہ طور پہ موجود ہے۔ اسی لیے نازکی، طرحداری، بلاغت، کشمکش، تجسّس، ڈرامائیت، رزمیت، اور رثائیت کی باہمی شراکت نے مثنوی کو کئی بامعنی خوبیوں سے متصف کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی خوبیٔ خاص کی بنا پر "ایک معیّنہ مقصد کے تحت واقعات نفس الامری کے ترکیبی ارتقاء اور گوناگوں فطرت کی نقاشی، اور اجزائے کائنات کی شاعرانہ توضیح اور تشریح کے لیے مثنوی بہت سہولت بخش صنف ہے۔"[۱]

---

[۱] (عبدالقادر سروری۔ اردو مثنوی کا ارتقاء ص ۱۳)

اسی سلسلے سے اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے کہ

"عربی میں ثنا ان چار دانتوں کو کہتے ہیں جو دو اوپر اور دو نیچے الگ الگ دوسرے دانتوں کی بہ نسبت بڑے ہوتے ہیں۔ اور اوپر والوں کو ثنا، عُلیا اور نیچے والوں کو ثنا، سفلیٰ کہتے ہیں۔ اسی مادّے کو باب تفعیل پر لے جاکر تثنی یا تثنیہ بنا جس کے معنی دو۔ دو الگ کرنا ہیں"

(اردو مثنوی ایک عمومی مطالعہ ص ۹)

مثنوی ایک ایسی بیانیہ صنف سخن ہے جس میں وضاحت، ڈرامائیت، واقعیت اور شعریت کی چہار دہ صفات ایک ساتھ بغیر کسی تضاد و فرق کے موجود ہیں۔ اب اگر ان میں سے کوئی ایک صفت کم ہو جائے تو اس کی تاثیریت یا توقیریت میں کمی واقع ہو سکتی ہے اسی لیے ہر اچھی اور جامع مثنویوں کے خالقین نے ان امورات سے چشم پوشی نہیں کی۔ اسی لیے مثنوی کے رمز شناس نقادوں نے اس کی ہر جہت خواہ فکری ہو یا ذہنی، ہیئتی ہو یا ترکیبی نظر رکھی ہے۔ اسی باعث اس کا فن قدرے پیچیدہ، بسیط اور مشکل ہے۔ یہی نہیں دو رد کی علامت شرقیہ کی بھی حامل ہے۔ "یہ سب سے اہم صنف ہے کیوں کہ اس میں ایک وسیع مضمون اور مربوط خیال کی نشو و نما کی گنجائش ہے۔" ص ۱

واقعہ یہ ہے کہ ایک معتبر شاعر ہی اس کی پیچیدہ رسی کو سیال صفت دے سکتا ہے۔ وگرنہ واقعہ یا قصہ کا بیان پیکر مضمون تک نہیں پہنچ پاتا ہے اور

ص ۱ عبدالقادر سروری۔ اردو مثنوی کا ارتقا ص

اس کی پیکریت کا حصول فوت ہو جاتا ہے۔ چوں کہ ہیئتی اعتبار سے یہ دوہری صنف ہے اس لیے ان کا باہمی رشتہ بہت اہم ہے۔ پیکریت کے متشکّل ہو جانے کی صورت آسان نہیں۔ اس کے لیے لوازمات فکریہ ہی کافی نہیں۔ کردار طرازی، واقعہ بیانی اور نظمیاتی روش کی بھی بہت اہمیت ہے۔ ڈرامہ کی طرح یہ بھی ابتدا، وسط اور انتہا کے التزام سے خالی نہیں اصطلاحِ شعر میں مثنوی اس نظم مسلسل کو کہتے ہیں جس میں شعر کے دونوں مصرعے کا ہم ردیف وہم قافیہ ہونا لازم ہے لیکن مثنویاں زیادہ تر غیر مردّفہ ہی لکھی گئی ہیں۔

مثنوی کی اصل شناخت یا اعتبار اس کی حقائق نگاری یا وقوع بیانی ہے۔ لازمی طور پر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ باہم مربوط ہوں۔ (معنوی بھی اور ہیئتی بھی) عموماً چھوٹی زمینوں پر زیادہ اور بڑی زمینوں پر کم مثنویاں کہی گئی ہیں، حالاں کہ مثنوی کی بقا و رضا کا انحصار اس کی بنیادی سرشت اور وقوعہ پر ہی ممکن ہے۔

اصناف شاعری میں مثنوی کی وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم میں زبان کو۔ زبان اس کی بنیادی صفت ہے جس پر توجہ مبذول رکھنا اور محتاط رہنا لازم ہے۔ زبان ہی اچھا، برا، گوارا، لائق، عمدہ اور بہت خوب کی تخلیقیہ صفات کو اجال سکتی ہے۔ زبان ہی روزمرّہ کی زندگی میں اعزاز و توقیر کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور یہی زبان اسے سماج و معاشرے کی نظروں میں گرا بھی سکتی ہے۔ اسی طرح مثنوی بہ ذات خود ایک ایسی زبان ہے جو اس کو باوقار یا بے وقار بنا سکتی ہے۔ اختصار، استعارہ سازی اور بیانیہ عنصر وہ بنیادی

خصائص ہیں۔ جن کے توسط سے مظاہر فطرت کو موعود کرنے، فکر و اذہان کا نقش بنانے اور عناصر کائنات کو مصور کرنے کی سہولت بہم ہوتی ہے۔ قدیم یا جدید مثنویوں میں افعال و اعمال میں فرق ضرور واقع ہوا ہے۔ عموماً ان مذکرہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ فوق الفطری عناصر یا خلافِ واقعہ موضوعات (غزل میں یہ عموماً ہوا ہے) کی شمولیت سے تحیر کی فضا خلق کرنے اور رگ تجسس کو بھڑکانے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی باعث خیرگیٔ چشم اور قلبی ہیجان کی تحیر خیزی کو ترقی ملی ہے۔ اور اسی کا دوسرا پہلو صدق و ہدایت، نیکی و صلابت اور اصلاح معاشرہ بھی ہے۔ مثلاً جس کے ذریعہ عشق و محبت کے جذبات، حسن و جمال کی مدح و ستائش دشت و باغ، کوہ و جبل، رنج و غم، راحت و خوشی، پستی و بلندی، حب الوطنی، رشک و حسد، حق گوئی، صداقت و اخلاق اور دوستی و دشمنی جیسی خارجی و باطنی صفات کو موثر طریقہ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہیتی اعتبار سے مثنوی کا دامن شعری بے حد وسیع ہے۔ اسی باعث ہر موضوع پر قابل قدر مثنویاں تخلیق کی گئی ہیں۔ عموماً مثنویوں کا مزاج داستانی ہے لیکن رفتہ رفتہ ترقیٔ علوم کے ساتھ ساتھ اس میں موضوعی تنوع بھی پیدا ہوا۔ اسے مغلق و پیچیدہ بیانی سے بچائے رکھنے کی کوشش کی گئی اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ اسلوب بیانیہ ہو، مبہم اور غیر واضح بیان سے احتراز کیا جائے۔ داستانی مثنویوں سے قطع نظر اعلیٰ، اخلاقی اور تاریخی مثنویوں میں غلو بیانی اور خلاف مزاج و عادات باتیں بیان نہ کی جائیں۔ فکر و موضوع کو آسان و سہل اور پر کشش بنائے رکھنے کے لیے لازم ہے کہ تشبیہی اور استعاراتی

ارکان کے استعمال میں محتاط روی اختیار کی جائے۔ قصہ یا واقعات کے توسط سے علوم اخلاقیہ کو مطمحِ نظر رکھا جائے تاکہ یہ صنف مقصدی فرائض بہ حسن و خوبی ادا کر سکے۔ ربط، تسلسل، ارتکازیت اور رمزیاتی تصوف پر خصوصی توجہ مبذول کی جائے۔ وہ اس لیے بھی کہ "مثنوی میں ربطِ کلام کا لحاظ رکھنا خاص کر جب اس میں تاریخ یا قصہ بیان کیا جائے نہایت ضروری ہے۔" [۱]

مثنوی کی بنیادی خصوصیت اس کا موضوعی تسلسل ہے اور اسی تسلسل کی تاثیریت یا جامعیت کو بنائے رکھنے کے لیے ایک مکمل اور واضح پلاٹ بہت لازم ہے۔ تاکہ حدود اشکال کے تحت قصہ کو یا موضوع کو تسلسل قائم رکھتے ہوئے پلاٹ کے حدود کا لحاظ رکھنا اور بیچ بیچ میں لطیف عناصرات کی آمیزش جائز مانی گئی ہے۔ یہ عناصرات قاری کی مرتکز انانیت کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہیں مگر بے ضرورت ان کی دخیلی مناسب نہیں۔ اسی تسلسل بیانی کے ضمن میں ڈاکٹر رفیق حسین صاحب کا ذیلی بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔

"قصہ یا واقعات کے بیان کرنے میں اتار چڑھاؤ ہونا چاہیئے۔ نتیجہ یا خاتمہ اسے دو موقعوں پر نکالنا چاہیئے کہ جب پڑھنے والے کے تمام خیالات تر قصہ کی دلچسپی میں انتہائی درجہ پر ہوں۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والا بیچ ہی سے نتیجہ نکال لے اور قصہ کو وہیں چھوڑ دے۔۔۔

ص ۱ مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۹۷

"۔۔۔ اور جو بات شروع میں لکھ دی گئی ہو اس کی تردید پھر کہیں اور نہ پائی جائے۔"[۱]

دوسری خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے۔ جو بھی کردار پیش کیے جائیں ان کی تمام تر امتیازی خصوصیات اس پیش کش میں موجود ہوں۔ ان کے اخلاق و عادات، حرکات و عمل، طور و طریق اور فکر و احساس کی تصویر نمایاں ہو سکے۔ کردار بہت متحرک، واضح اور مکمل تصویریت کے حامل ہوں۔ کرداری اصالت کو غلو، خلافِ واقعہ، عادات و اطوار سے مبرّا رکھنا لازم ہے۔ تاکہ ان کی اصالت، مشکوک و مشتبہ نہ ہوں۔

مکالمہ آرائی کا تعلق کرداری اصالت سے بہت قریب کا ہے۔ اسی لیے اسی مناسبت سے مکالموں کے عمل تخلیقیہ کا تعیّن کیا جانا چاہیے اور ان کے مراتبات کا بھی بہ طور خاص خیال رکھا جانا بہت ضروری ہے۔

زبان و بیان کی مناسبت سے واقعات کی ترتیب اور پیش کشی ضروری ہے۔ کیوں کہ کردار اور ان کے مکالموں کا صریح تعلق زمان و مکاں سے ہی منسوب ہے۔ استعمالی اشیاء، لباس و آرائش اور طرز گفتگو کے مابین مناسبت لازم ہے۔ وقت کی مطابقت سے فکر و احساس کی تصویریت حقیقت افروز ہو جاتی ہے۔

موقع و محل کی مناسبت سے اسلوبی رویّہ کا تعیّن کرنا بہتر ہے۔

---

[۱] مختصر ادبی مضامین ص ۷۶

تاکہ تمام عناصرات کے مابین تناسب کی کمی واقع نہ ہو۔ اور اسلوب کی اصالت اپنی تمامیت محفوظ رکھ سکے۔ روزمرّہ، محاورہ، الفاظ و تراکیب، مرکبات، تماثیل، استعارات، تشبیہات کے استعمال میں معتدل رویّہ اختیار کرنا لازم ہے۔

موضوعی اعتبار سے اس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ کون سا ایسا موضوع ہے جو اس کے احاطۂ بیان میں موجود نہیں۔ اس کی جامعیت اور افادی نوعیت سے کوئی انکار ہی نہیں۔ یہ اپنی وسیع المزاجی کے باعث اردو شاعری کے ہر شعری منطقے میں دخیل ہونے کا حق رکھتی ہے جیسا کہ شبلی لکھتے ہیں۔

"انواع شاعری میں یہ صنف بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ جذبات انسانی مناظر قدرت، تاریخی واقعہ، عشق و محبت، اخلاق و تصوّف اور مسائل وقت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں۔"[1]

بیش تر مثنویاں داستانی عواملات پر مبنی ہیں۔ لیکن اپنی لچکیلی صفات کے باعث حیات و کائنات کے دیگر مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان پر نظر رکھی۔ کلیم الدین احمد[2] کا یہ خیال سو فیصد درست ہے کہ

"مثنوی میں رزمیہ شاعری ہو سکتی ہے اور نئے نئے افسانوں کی ایجاد بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا کے گوناگوں بدلنے والے مناظر کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی جا سکتی ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سارے نفسی کوائف کا بیان ہو سکتا ہے۔"

---

[1] شعر العجم جلد چہارم ص ۲۰۵ [2] اردو شاعری پر ایک نظر ص ۲۰۳

"۔۔۔ اور جو بات شروع میں لکھ دی گئی ہو اس کی

تردید پھر کہیں اور نہ پائی جائے۔"[۱]

دوسری خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے۔ جو بھی کردار پیش کیے جائیں ان کی تمام تر امتیازی خصوصیات اس پیش کش میں موجود ہوں۔ ان کے اخلاق و عادات، حرکات و عمل، طور و طریق اور فکر و احساس کی تصویر نمایاں ہوسکے۔ کردار بہت متحرک، واضح اور مکمّل تصویریت کے حامل ہوں۔ کرداری اصالت کو غلو، خلافِ واقعہ، عادات و اطوار سے مبرّا رکھنا لازم ہے۔ تاکہ ان کی اصالت، مشکوک و مشتبہ نہ ہوں۔

مکالمہ آرائی کا تعلق کرداری اصالت سے بہت قریب کا ہے۔ اسی لیے اسی مناسبت سے مکالموں کے عمل تخلیقیہ کا تعیّن کیا جانا چاہیے اور ان کے مراتبات کا بھی بہ طور خاص خیال رکھا جانا بہت ضروری ہے۔

زبان و بیان کی مناسبت سے واقعات کی ترتیب اور پیش کشی ضروری ہے۔ کیوں کہ کردار اور ان کے مکالموں کا صریح تعلق زمان و مکاں سے ہی منسوب ہے۔ استعمالی اشیاء، لباس و آرائش اور طرزِ گفتگو کے مابین مناسبت لازم ہے۔ وقت کی مطابقت سے فکر و احساس کی تصویریت حقیقت افروز ہو جاتی ہے۔

موقع و محل کی مناسبت سے اسلوبی رویّہ کا تعیّن کرنا بہتر ہے۔

---

[۱] مختصر ادبی مضامین ص ۷۶

تاکہ تمام عناصرات کے مابین تناسب کی کمی واقع نہ ہو۔ اور اسلوب کی اصالت
اپنی قائمیت محفوظ رکھ سکے۔ روزمرّہ، محاورہ، الفاظ و تراکیب، مرکبات،
تماثیل، استعارات، تشبیہات کے استعمال میں معتدل رویّہ اختیار کرنا لازم ہے۔
موضوعی اعتبار سے اس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ کون سا ایسا موضوع
ہے جو اس کے احاطۂ بیان میں موجود نہیں۔ اس کی جامعیت اور افادی نوعیت سے
کوئی انکار نہیں۔ یہ اپنی وسیع المزاجی کے باعث اردو شاعری کے ہر شعری منطقے
میں دخیل ہونے کا حق رکھتی ہے جیسا کہ شبلی لکھتے ہیں۔

"انواع شاعری میں یہ صنف بہ نسبت زیادہ مفید،
زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ جذبات انسانی مناظر قدرت،
تاریخی واقعہ، عشق و محبت، اخلاق و تصوّف اور مسائل
وقت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں۔" [1]

بیشتر مثنویاں داستانی عوامل پر مبنی ہیں۔ لیکن اپنی لچکیلی صفات
کے باعث حیات و کائنات کے دیگر مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان پر نظر رکھی۔
کلیم الدین احمد [2] کا یہ خیال سو فیصد درست ہے کہ

"مثنوی میں رزمیہ شاعری ہو سکتی ہے اور نئے نئے افسانوں
کی ایجاد بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا کے گوناگوں بدلنے والے
مناظر کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی جا سکتی ہیں اور زندگی کے
مختلف پہلوؤں سے سارے نفسی کوائف کا بیان ہو سکتا ہے۔"

---

[1] شعر العجم جلد چہارم ص ۲۰۵ [2] اردو شاعری پر ایک نظر ص ۲۰۳

دراصل یہ ایک ایسی ہی لچکیلی صنف سخن ہے جس کا امکانی ادبیہ،
جامعیتی احساس، توضیحی لوازمات کی بلاشبہ خوبی نے قبولیت کی راہیں استوار
کر دی ہیں۔ "کیوں کہ اس میں ایک ایسی وسیع مضمون اور مربوط خیال کے
نشو و نما کی گنجائش ہے۔" چنانچہ ان کی تقسیم بہ اعتبار موضوع ہی ممکن ہے۔
موضوعی اعتبار سے کچھ خاص مثنویوں کے نام ملاحظہ ہوں۔

سیاسی و تاریخی مثنویاں: شاہنامہ اسلام (حفیظ جالندھری)
خاور نامہ (رستمی)، خانہ جنگی (کیفی اعظمی)، تاریخ اسکندری (نصرتی)، حزن اختر
(واجد علی شاہ) ظفر نامہ (راجہ رام صفیر) افسانۂ لکھنؤ (آغا حجو شرف)،
ظفر نظام شاہ (شوقی)

عاشقانہ: مینا وستونتی (غواصی)، طوطی نامہ (مرزا جعفر علی
حسرت)، لیلیٰ مجنوں (نواب مرزا محمد تقی ہوس)، طلسم الفت (قلق) زہر عشق
(مرزا شوق)، نالۂ تسلیم (تسلیم لکھنوی)، چندر بدن و ماہیار (مقیمی) اسرار
محبت (محبت)، دریائے عشق (میر تقی میر)، بحر المحبت (مصحفی) وغیرہ

عارفانہ: رموز العارفین (میر حسن)، آب و سیراب (جمیل مظہری)
پنچھی باچھا (وجدی)، نسیم عرفان (منور لکھنوی) گلشن حسن و دل (محمود بحری)

منظری: جلوۂ صد رنگ (شمس عظیم آبادی)، حسن فطرت
(عبرت گورکھپوری)، سیر دریا (نظیر اکبر آبادی).

قومی: یادِ وطن (شمس عظیم آبادی) نشو و نما ہند (عبرت گورکھپوری)

سماجی: بہارِ سخن (میر شیر علی افسوس)، پارسا نامہ (جرّاد فیض آبادی)
مذہبی: معراج المضامین (منیر شکرہ آبادی)، صبح تجلّی (محسن کاکوروی)،
عاشور نامہ (روشن علی)، نجات نامہ (ایاغی)، خوب ترنگ (خوب محمد)، ماہ پیکر
(شیخ احمد جنیدی)

بحر و اوزان کی رو سے اس کے لیے عموماً سات بحریں مخصوص کی گئی ہیں۔
وہ اوزان درج ذیل ہیں۔

I۔ متقارب مثمن مقصور یا محذوف
فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول

II۔ رمل مسدس مقصور یا محذوف
فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلان یا (فاعلات)

III۔ رمل مسدس مخبون مقصور یا محذوف / مقطوع
فَاعلاتن۔ فَعِلاتن فِعلُن یا فعلان / فَعِلُن

IV۔ ہزج مسدس مقصور یا محذوف
مُفاعیلُن مُفَاعِیلُن مُفَاعیل یا فعولُن

V۔ ہزج مسدس مقبوض
مفعول مُفَاعِیلُن فَعُولُن / مفاعیل

VI۔ سریع مسدس مطوی مکشوف
مُفتَعِلُن مُفتَعِلُن فَاعِلُن یا فاعلات

VII۔ خفیف مسدس مطوی مخبون مقصور یا محذوف۔

فاعلاتن مفاعلن فعِلن یا فَعِلن یا فِعلان

ان پسندیدہ سات بحروں کے علاوہ دوسری بحروں میں بھی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ گیان چند جین نے میر کی "جوشِ عشق" کو بحر متدارک مثمن مجنون میں، مومن کی "کفِ آتش" کو بحر متقارب مثمن اثرم مقبوض میں اور حالی کی "کلمۃ الحق" بحر متقارب اثلم میں اور رنگین کی دو مثنویوں (مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن، فعلن فعلن فعلن فع) کا ذکر کیا ہے۔

قدما نے ان معینہ سات بحروں کا احترام ملحوظ رکھا مگر متوسط اور دور جدید کے شعراء نے اس سے انحراف کرتے ہوئے دوسری بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مثنوی میں کئی کئی بحروں کے تجربے کیے۔ شاہ آیت اللہ جوہری نے "گوہر جوہری" میں دو بحریں واجد علی شاہ اختر کی ۸ فصلوں کی ۸ بحریں دتاتریہ کیفی کی مثنوی "جگ بیتی" ایک ایسی مثنوی ہے جس کی ہر فصل کی بحر نئی ہے۔

ہر فصل کی ہے بحر الگ، اس سے ہے مقصود
بے لطفیٔ یک آہنگی کی ہو نظم سے مفقود

صرف یہی نہیں افضل نے "بکٹ کہانی" میں بارہ ماسہ کے طرز پر بارہ مہینوں کا حال نظم کیا ہے۔ میر اثر کی "خواب و خیال" میں ۱۱۲ غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں درد نے اپنی مثنوی سراپا کے انداز میں لکھی ہے۔ جرأت نے "کارستان الفت" میں دوہے بھی درج کیے ہیں۔ انشا نے "سحر حلال" میں صنعتِ تجنیس کا استعمال کیا ہے۔ اور دو مثنویاں ریختی کے انداز میں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ حفیظ جالندھری کی "شاہ نامہ اسلام" مرزا رسوا کی "نو بہار" جوش ملیح آبادی کی "جنگل کی شہزادی"

اقبال کا "ساقی نامہ" جمیل مظہری کی "آب و سراب" اور عبدالحمید شمس عظیم آبادی کی "حیات و کائنات" وغیرہ کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

مثنوی کے اس شعری تسلسل کو منضبط رکھنے کے لیے درج ارکان کا تعین لازم مانا گیا ہے۔

i۔ حمد و نعت اور مناجات و منقبت

ii۔ مدح حاکم

iii۔ تعریف سخن

iv۔ سبب تالیف

v۔ اصل قصہ

مثنوی کے یہ وہ اجزاء ہیں جن کے باہمی ارتباط والتزام سے کوئی قصہ یا واقعہ تکمیلیت کا مرحلہ طے کرتا ہے۔ اس تکمیل سازی میں اماکنات و اشخاص، چرند و پرند، کوہ و صحرا، دشت و بیابان، آب و گیاہ، قصر و محلات، مرئی و غیر مرئی اشیاء، دیو پریاں، جنات، طلسم، نیک و بد اثرات، آسیب، بدروحیں، اخلاق و کردار، دین و مذہب، بے دینی، شر، فساد اور تاریکی و روشنی کا ذکر موقعہ و محل کی مناسبت لازم و ملزوم ہیں۔ عموماً مثنویاں وصل معشوق یا ہجر و فراق پر منتہا ہوتی ہیں۔ غم یا خوشی اختتامیہ حصہ ہیں۔ مگر نئی روشنی کی نئی مثنویاں فلاح و نیکی، استقامت و انقلاب اور امید و یقین کا علامتی پیغام بھی ہیں۔

(۲)

اردو مثنوی کو اصناف شعری میں اوّلیت حاصل ہے۔ ابتدائی دور کی مثنویاں جو عموماً پند و نصائح پر مبنی تھیں اور مختصر بھی تھیں۔ کم یاب ہیں جو دستیاب بھی ہیں۔ وہ زیادہ تر برج بھاشا کے نزدیک یا ٹھیٹھ ہندوی مزاج رکھتی ہیں یہی نہیں ان کے اوزان بھی عموماً ہندی سے ماخوذ ہیں۔ اس قبیل مثنویوں میں اولیت بابا فرید گنج شکر کی مختصر مثنویاں ہیں۔ جن کا ذکر کتابوں میں منقول ہے مگر دستیاب نہیں۔ اس سلسلے میں محمود شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں اس کی تصدیق کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کی زبان صاف اور سادہ ہی نہیں بحور بھی فارسی کی ہیں۔

پہلی تحقیق کے مطابق اعجاز محمدی موسوم بہ "گلشن ایمان" ہے۔ اس سن تصنیف ۱۵۱۲ء ہے۔

اس کے علاوہ بہت ساری منظوم مذہبی اور اخلاقی روائتیں رسالہ جات کی شکل میں موجود ہونے کی اسناد بہم ہو گئی ہیں۔ خوش نامہ۔ جوش نغز اور شہادت الحقیقت قدیم مثنویاں ہیں۔

شیخ عثمان کی مثنوی "چتراولی" کئی اوزانوں پر ٹھیٹھ ہندی زبان میں لکھی گئی۔

اسی طرح ابتدائی دور کی ایک اور سب سے اہم مثنوی "خوب ترنگ" ہے۔ جسے خوب محمد نے ۱۵۷۷ء میں مکمل کیا۔ خوب ترنگ مشکل اور دقیق

بیانیہ اسلوب کی حامل ایک عمدہ مثنوی ہے۔ جس کا موضوع اخلاق و تصوف ہے جیسے چھوٹے چھوٹے قصوں نے ارتباط باہم سے تکمیلیت عطا کی۔

عہد بہمنی کا ایک اور مشہور و معروف شاعر نظامی ہے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ) کے زمانہ میں موجود تھا۔ "کدم راؤ پدم راؤ" ایک عشقیہ مثنوی تخلیق کی۔ زبان نہایت قدیم، پیچیدہ اور گنجینہ ہے۔

کدم راؤ رکھیں رن و نہ آدھر
کہ رھن بات سن بات بک بت دھر

—

اس کے علاوہ اس عہد کے دوسرے شعراء ہیں سید محمد اکبر حسینی، مشتاق، لطفی، شاہ میران جی شمس العشاق اور آذری کی اہمیت مسلم ہے۔
اس سلسلے میں شاہ میران جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ) کی مثنوی "خوش نامہ" کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کبھی نہ رنگے میرا ہی رنگوں، پھولوں باس نہ آیا
رنگ نہ رنگیا دنتو اس کے بھینی نہ ہلدوں کا یا

—

آذری نظامی کے بعد دوسرا اہم شاعر ہے جس نے سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ) کے حکم کے بموجب "بہمن نامہ" دکھنی سلطان ہمایوں شاہ تک نظم کیا اور پھر اسی کے بعد اس کی تکمیل ملا نظیری اور ملا سامی نے کی۔

مثنوی کے ارتقائی مدارج کے ضمن میں طاہر فاروقی لکھتے ہیں ۱

"سب سے طویل مثنوی جس کو یقین کے ساتھ اردو زبان کی پہلی مثنوی کہا جاسکتا ہے "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ نظامی نے ۸۶۵ تا ۸۶۷ کے درمیان لکھی۔ نظامی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ اس کے بعد دو اور ممتاز مثنوی گو تھے۔ فیروز اور محمود ان کی مثنویاں موجود ہیں لیکن وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری اور ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن میں ان دونوں کا ادب سے ذکر کیا ہے۔"

عہد بہمن شاہ کے شاعروں نے مثنوی کے ساتھ غزل پر بھی طبع آزمائی کی۔ فیروز شاہ خاندانِ بہمن کا وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے سیاسی تدبّر سے نہ صرف بہمنی سلطنت کو ترقی دی بلکہ ایک مشترکہ تہذیب و تمدّن کے احیاء میں بھی حصّہ لیا۔ ۱۵۲۷ء میں سلطان کلیم اللہ کی وفات کے بعد اس شمالی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد تمام صوبوں نے اپنی الگ الگ سلطنتیں قائم کیں جنہوں نے اپنے کو مقامی تمدّنی دھارے میں سمو لیا اور دکنی کلچر کو مہمیز کیا۔ صوبائی حکمرانوں نے علم و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی۔

---

۱ ادیب۔ جنوری ۱۹۶۱ء

بیجاپور کے حکمرانوں نے علماء و مشائخ کی پذیرائی کی۔

علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ تا ۱۰۸۳) کے عہد میں شاعری نے نمایاں ترقی کی۔ اس کی سو سالہ عرصہ حاکمیت میں لاتعداد مثنویاں لکھی گئیں۔ جن کا موضوع عموماً تصوف، مذہب، فقہ اور اخلاقی قصے تھے۔ شاہ برہان الدین جانم، مقیمی، عبدل، امین، شوقی، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی، شاہی، نصرتی، شاہ ملک، امین، ہاشمی، ایاغی، شغلی، علی، مرتضیٰ، مختار، قدرتی، مومن، قادر، معظم، سوا، علائی وغیرہ نے عمدہ مثنویاں تخلیق کیں ہیں۔ خصوصاً مقیمی، اعلیٰ، رستمی، نصرتی، ہاشمی وغیرہ کو ان سب میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

مقیمی (محمد مقیم) کی دو مثنویاں "چندر بدن و ماہ یار" اور "سومہار کی کہانی" غیر معمولی مقبولیت کی حامل رہی ہیں۔ چندر بدن کا سال تخلیق ۱۰۵۰ھ۔ زبان مشکل اور پیچیدہ۔

وہ چنچل چھبیلی اسے دیکھ کر
ہوئی آپ میں تھی وہ پریاں جگر

صنعتی (محمد ابراہیم خاں) کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں اول "قصہ بے نظیر" دوم "گلدستہ"۔ پہلی مثنوی قصہ بے نظیر کا سال تخلیق ۱۰۵۵ھ مطابق ۱۶۴۴ء ہے جس میں آنحضرت کے صحابی حضرت تمیم انصاری کی مہمات بیان کی گئی ہے اور دوسری "گلدستہ" عاشقانہ مثنوی ہے۔

رستمی (کمال خاں بن اسمٰعیل خاں) کی ایک ضخیم مثنوی "خاور نامہ" ہے۔

جس میں حضرت علی کے اوصاف اور کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی طویل ہے۔
۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ۱۰۵۹ھ مطابق ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوئی ہے[1]
دراصل یہ مثنوی ابن حسام کے فارسی خاورنامہ کا ترجمہ ہے۔

فلک نو طبق گوہراں سوں سوار
ہوا کون بی زیور کیا صد ہزار

ملک الشعراء نصرتی (محمد نصرت) علی عادل شاہ کے مصاحب خاص میں تھا۔ اس کی تین تصانیف دستیاب ہیں۔ "گلشن عشق" (۱۰۶۸ھ) جس میں کنور منوہر اور مالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ دوسری "علی نامہ" (۱۰۷۶ھ) تاریخی رزمیہ ہے جس میں علی عادل شاہ کی فتوحات اس کے کردار اور مرتبے کا ذکر تفصیل سے درج ہے۔ اور تیسری تاریخ اسکندری (۱۰۸۲) اس کی شعری برتری کا ثبوت اس کی قادر الکلامی کی شگفتہ بیانی، الفاظ و تراکیب اور تشبیہی ارکان کے مادرانہ استعمال میں مضمر ہے۔

سب اس دھات فوجاں خوش آراستہ
چلیاں تھیاں عروساں ہو نو خواستہ

---

[1] علی ابراہیم خاں نے خاورنامہ کے اشعار اور اس کی تصاویر کی تعداد کی صراحت کی ہے۔ اس کے مطابق اس میں ۲۳ ہزار سات سو ۳۵ اشعار اور ۱۵۰ تصویریں ہیں بہ حوالہ دکن میں اردو ص ۲۱۱

ہر ایک مرد کا شوق تلذذ ہوا
لٹا پٹ بدل ذوق تازہ ہوا

علی نامہ سے

چندر مجھ اوپر زہر کا ہوا باغ
دیوے ہر ستارا میرے دل پہ داغ
محبت سوں چھاتی لگا تیں چھکل
ہجر تیں کی جہاں دل سوں ادبل

گلشنِ عشق سے

ملک خوشنود کی دو مثنویاں "ہشت بہشت" اور "بازار

بمدست ہوئیں ہیں۔

علیم الدین اعلیٰ شاہ برہان الدین جانم کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔
"محب نامہ" مشہور ہے۔ اس کے علاوہ "رموز المساکین" "نظم وجودیہ" اور
"نظم قربیہ" مشہور ہیں۔

شاہ ملک کی احکام الصلوٰۃ "مذہبی مثنوی ہے۔ ۱۰۷۷ھ میں
تخلیق کی۔ ہاشمی (سید میراں) مہدوی مذہب کا پیرو تھا۔ "یوسف وزلیخا" مشہور ہے
اس عہد کی دوسری مثنویوں میں ابراہیم نامہ (عبدالغنی عبدل)
بہرام وحسن بانو (امین) فتح نامہ نظام شاہ (شوقی) نجات نامہ (ایاغی)
پند نامہ (شغلی) معراج نامہ (محمد مختار) قصص الانبیا (قدرتی) اسرار عشق (مومن)
گلزار جنت (معظم) روضۃ الشہدا (سیوا) قابل ذکر ہیں۔

سلطان قلی نے قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے ۹۲۴ھ مطابق
۱۵۱۸ء میں قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی جو ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۸۷ء
تک قائم رہی۔ اس سلطنت کے سلطانوں نے خود کو مقامی تمدنی ڈھانچے
میں ضم کر لیا تھا۔ انہوں نے مقامی دکنی کلچر کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اس کو ترقی
دی۔ اس خود مختار حکومت کا پایۂ تخت گولکنڈہ تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ کے
بعد اس کے خاندان کے سات اشخاص نے حکمرانی کی۔ ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۸۷ء
میں اورنگ زیب نے اس مثالی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

اس خاندان کے سلاطینوں میں سلطان قلی (۹۲۴ھ سے ۹۵۰ھ)
جمشید علی (۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ) سبحان قلی (۹۵۷ھ تا ۹۵۷ھ) ابراہیم قلی
(۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) محمد قلی (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ
تا ۱۰۳۵ھ) عبداللہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) ابوالحسن تاناشاہ (۱۰۸۳ھ
تا ۱۰۹۸ھ)

سلطان قلی بہمنی حکومت میں تلنگانہ کا صوبیدار تھا۔ ۹۲۴ھ میں
اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے قطب شاہی سلطنت قائم کی۔

اس دور میں لاتعداد طول و مختصر مثنویاں لکھی گئیں۔ جو زیادہ تر
فرضی واقعات پر مبنی تھیں۔ لیکن بیشتر مثنویوں کا بیانیہ تسلسل، کردار نگاری،
واقعہ نگاری، تفریحی وقائع، تشبیہی تواتر اور تخیل پردازی قابلِ تعریف
ہے۔ اہم شعراء میں قطب الدین فیروز (۹۶۲ھ) اسداللہ وجہی، غواصی،
احمد، جنیدی، ابنِ نشاطی، طبعی، عاجز، شاہ محمد افضل اور محمد رفیع فتاحی

قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ قطبیؔ، محبؔ، فائزؔ، غلام علی، لطیف وغیرہ نے بھی کئی اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔

فیروزؔ بیدری کی "توصیف نامہ موسوم بہ پرت نامہ" بہت مشہور ہے جس میں ۱/۲ ۷ ہزار شعر ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ اس کے ہم عصروں میں ملّا خیالیؔ اور سید محمودؔ لائقِ ذکر ہیں۔ اس مثنوی میں سید عبدالقادر جیلانی کے حالات اور مدح کے پہلو درج ہیں۔ اور آخر میں اپنے مرشد شیخ ابراہیم مخدوم کے مدحیہ اشعار بھی شامل کیے ہیں۔

کہ باغ علی کوں تو گلشن کیا
چراغ حسین کوں تو روشن کیا

وجہیؔ نے اپنا ایک اور تخلص وجیہیؔ اختیار کیا تھا۔ "قطب مشتری" اسی سے منسوب لاجواب مثنوی ہے۔ جس کا ہیرو محمد قلی قطب شاہ ہے مثنوی کا اسلوب شعری پاکیزہ اور شستہ ہے۔ زبان بہ مقابلۂ اول صاف اور سادہ ہے۔ اس کے کردار "سب رس" کی طرح مثالیہ ہیں۔ اور ان میں اجرام سماوی یا فلکی کے سارے نام قطب کی رعایت سے لائے گئے ہیں۔ ہندی لفظوں کے استعمال میں سلیقہ شعاری اور مشاقی نمایاں ہے۔ عربی اور فارسی لفظوں کو بھی ہندیاتی لہجہ عطا کر دیا ہے۔

توں اول توں آخر توں قادر اہے
توں مالک توں باطن توں ظاہر اہے

ہر ایک خوبصورت ہر ایک خوش لقا
سو ہر ایک دل کش، ہر ایک دل ربا
مہابت کے کاماں میں جم جم ہتے جیو
شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیو

—

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات
کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
جسے بات کے ربط کا نام نیں
اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نیں

—

احمد کی "لیلیٰ مجنوں" اور "مصیبتِ اہل بیت" دو مثنویاں اس سے منسوب ہیں۔ زبان مشکل اور پے چیدہ ہے۔

جو مبنغ بخت کوں فتح یاور ہوا
سو مبنغ بخت کا سیوک انبر ہوا

—

بلا کیسی کربلا میں پڑی شاہاں تج اوپر
مج ہلالاں تیرے نیکیاں ہور اندھارا یقین

غواصی قلی قطب شاہ کے عہد کا دوسرا باکمال شاعر ہے۔ جس سے تین مثنویاں منسوب ہیں۔ ایک سیف الملوک و بدیع الجمال، دوسری طوطی نامہ۔ تیسری چندر بدن اور لورک موسوم بہ نام مینا وشونتی۔ سیف الملوک ۱۰۳۵ھ میں تخلیق ہوئی۔ طوطی نامہ، ضیاء الدین نخشبی کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے جس کا سن ترجمہ ۱۰۴۹ھ ہے۔ پہلی مثنوی قدرے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس کے کلام میں ٹھیٹ ہندی لفظوں کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ دو ہزار شعروں پر مشتمل یہ مثنوی سادہ سلیس بیانیہ اسلوب کے باعث اپنے عہد کی بے حد مقبول مثنوی رہی ہے۔

جو دریا لہو کا ابلنے لگیا
گگن اس پہ کشتی ہو چلنے لگیا

مگر کیا برج میں میرے چندر ہے
ستارے کا مرے مجھ پر نظر ہے
جو میں ہم سے طبع آزمائی کروں
تو ساریاں اُپر پیشوائی کروں
گگن ساتوں دفتر میرے شعر کے
ستارے سو جوہر میرے شعر کے

نشاطی "پھول بن" جیسی عمدہ مثنوی کا خالق ہے۔ اس نے اپنے

پیش رو شاعروں میں فیروز، محمود، احمد اور شوقی کی تعریف کی ہے۔ یہ فارسی قصہ بساتین کا ترجمہ ہے۔ ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی جس میں ۱۷ سو شعر ہیں۔ صنائع بدائع کی کثرت ہے جس کی وجہ سے راستی یا حقیقت کو نقصان پہنچا ہے۔ رزم و بزم کے بیان سے اس کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتے یک شہر شرق کے کدھیں تھا
کہ اس کا ناناوں سوں کنچن پٹن تھا

نام اور تاریخ تخلیق کے متعلق لکھیا ہے۔

صفادار اس کے ویک ہر یک چمن میں
رکھیا ہوں ناںوں اس کا پھول بن میں
اتھا تاریخ تو لایا یہ گل زار
اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چار

۱۰۷۶ھ

محمد فتی فتاحی قادریہ مسلک کا شاعر تھا۔ اس کی دو مثنویاں بہ نام مفید الیقین اور شعب ایمان مشہور ہیں۔ مفید الیقین میں آنحضرت صلعم کے حالات، سراپا، نور محمدی اور معجزات کا تذکرہ ہے یہ ۱۰۵ھ۱ میں تخلیق ہوئی۔ شعب ایمان ۱۱۲۰ھ میں مرتب ہوئی۔ اس میں فقہی مسائل نظم کیے گئے ہیں۔ عقائد و مسلک سے متعلق سو مسئلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

محمد نبیؐ یوں فتح بازی کیے
او ملعون کوں یوں ہزیمت دیئے

کہوں حمد و ثنا اس پاک رب کوں
جینے پیدا کیا خلقت عدم سوں

اس دور کی دوسری مثنویوں میں لیلیٰ مجنوں (عاجز) بشارت الانوار (خداوند خدا نما) ماہ پیکر ۱۰۶۴ھ (جنیدی) معراج نامہ (سید بلاقی) بہرام و گل اندام (طبعی) معجزہ حضرت فاطمہ (محبؔ) جنگ نامہ (سیوک) ظفر نامہ (غلام علی خاں لطیف) وغیرہ کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ منجملہ ان سبھی مثنویوں کی زبان حسب روایت دکھنی اردو ہے۔ ہندی اور بھاکا کے لفظوں کے استعمال میں ہنرمندی موجود ہے۔ کچھ مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

مدد پنجتن پاک و بارہ امام
مدد پیر میران منزہ مقام

عاجز

اناراں کے جھاڑاں کلیاں بار تھے
کہ لالے میں یاقوت کے سار تھے

جنیدی

ملاحت میں جیوں سورچندر ہے توں
صلابت منے جیوں سکندر ہے توں
طبعی

—

قدم پر تمارے ہمیں رکھتے سر
بھوت وقت سوں سب اتھے منتظر
محب

—

ولایت ملک کچ نہ تھا اس کو کم
کسی کی طرف تے نہ تھا اس کو غم
فائز

—

طبل حیدری یوں تو بجنے لگیا
کہ جوں جگ پو بادل گرجنے لگیا

—

لطیف

نظام شاہی اور بریدشاہی سلطنتوں نے بھی زبان و ادب اور علوم شرقیہ کی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی۔ نظام شاہی حکومت کا بانی ملک احمد بحری تھا۔ جو ملک نائب بحری کا لائق بیٹا تھا۔ احمد بحری نے نظام الملک کا لقب اختیار کرتے ہوئے ۸۹۵ھ میں بہمنی حکومت سے قطع تعلق کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔

احمد نظام شاہ (۸۹۵ھ - ۹۱۴ھ) برہان نظام شاہ (۹۱۴ھ - ۹۶۱ھ) حسن نظام شاہ (۹۶۱ھ - ۹۷۲ھ)۔ مرتضے

نظام شاہ (۹۷۲ھ - ۹۹۶ھ) میرا حسین (۹۹۶ھ - ۹۹۶ھ)
برہان ثانی (۹۹۶ھ - ۱۰۰۳ھ) ابراہیم نظام شاہ (۱۰۰۳ھ - ۱۰۰۳ھ)
بہادر نظام شاہ (۱۰۰۳ھ - ۱۰۰۹ھ) مرتضیٰ ثانی (۱۰۰۹ھ - ۱۰۰۹ھ)
برہان ثالث (۱۰۰۹ھ - ۱۰۴۳ھ) کا عرصۂ حکومت بہت زیادہ طویل نہیں
ہے اور بعضوں کی حکمرانی چند ماہ کی ہے۔

اس حکومت کا پہلا اہم شاعر شیخ محمد اشرف ہے۔ وہ شاہ ضیاء الدین
بیابانی کا مرید اور معتقد تھا۔ اشرف بیابانی کے نام سے شہرت پائی۔ "نوسرہار"
اس کی مشہور مثنوی ہے جس میں اس نے کسی بادشاہ کی مدح نہیں کی۔ ابتدا یہ حمد،
نعت، منقبت کے بعد حضرت امام حسینؑ کے مصائب اور حالات کربلا منظوم کیے۔
واقعات کربلا سے متعلق دکھنی زبان کی یہ پہلی مثنوی ہے۔ یہ مثنوی ۹ ابواب پر
مشتمل ہے۔ اسی لیے اس کا نام "نوسرہار" تجویز کیا۔ پہلا باب حمد و نعت کا،
دوسرا سبب تالیف کا۔ اور تیسرے باب کی ابتداء حالات امام حسینؑ سے کی
گئی ہے۔ دکنی زبان کی یہ قدیم مثنوی ۹۰۹ھ کی تخلیق کردہ ہے۔

صاحب مثنوی بانیٔ خاندان بیابانی سید شاہ ضیاء الدین بیابانی معروف
بہ شیخ ضیاء فقرآبادی (۸۱۱ھ - ۹۰۹ھ) ابن سید عبدالکریم کے فرزند ہیں۔
۲ ذیقعدہ ۸۶۴ھ بہ روز پیر بہ وقت ظہر قصبہ فقرآباد تعلقہ انبڑ ضلع
اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔

اشرف کی نوسرہار نایاب شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہیں
مقامی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ واقعہ کربلا اور شہادت امام حسینؑ کو

بہ حسن و خوبی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کوشش حسن بلیغ کا خوبصورت استعارہ ہے۔ بیانیہ طور طریق نے مصوّر کر دیا ہے۔ مقتلِ حسین کی تصویر نظروں کے رو برو پھر جاتی ہے۔

اتر گھوڑے ہوا پاؤں　　علی اکبر اس کا ناوٗں
دوڑ آیا حسین کن　　بارہ برس کیری رسن

علی اکبر آبا رن　　اوُن لاگے میگلے جن

اس دور کا دوسرا بڑا شاعر حسن شوقی ہے۔ "فتح نظام شاہ" یادگار ہے۔

اسی طرح بریدشاہی کا ایک شاعر قریشی کے نام سے مشہور رہے جس کی مثنوی "بھوگ بھل" ۱۰۲۲ھ کی تخلیق ہے جنسی امور کو نظم کیا گیا۔ ہے۔ قریشی کے علاوہ اس مملکت میں کسی اور کامل شاعر کی اطلاع ہم نہیں ہوئی۔ ان شمالی حکومتوں کے خاتمہ کے بعد مغلیہ حکومت کا یہ حصہ بن گئے۔ اور علم و ادب کی وہ مرکزیت ختم ہو گئی۔ جس سے ہندیائی تہذیب کی ثمریابی کا حصول ممکن ہوا تھا۔" اس میں شک نہیں کہ مغلوں کے حملوں کی وجہ سے جنوب کے سیاسی اور علمی مرکزوں پر یکے بعد دیگرے تباہی نازل ہوتی رہی۔ لیکن گولکنڈہ کی تباہی سے پہلے تک یہ ہوتا رہا۔ کہ گجرات کی تباہی کے بعد گجرات کے اکثر علماء اور شعراء بیجاپور چلے گئے۔ بیجاپور کی

شکست کے بعد ان کے لیے گولکنڈہ کا ایک مرکز رہ گیا تھا جہاں کچھ عالم، ادیب اور شاعر چلے آئے۔ جب یہ آخری مرکز بھی مسدود ہو گیا تو دکن کے شاعر منتشر ہونے لگے[۱]۔ مگر مغلیہ حکومت پائداری نہیں حاصل کر سکی۔ تقریباً مختلف قلعہ دار یا صوبیداروں نے مغلیہ جبروت کے تقابل میں اپنی اپنی کمریں کس لیں۔

۱۱۳۶ھ میں نواب قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے فتح یابی کے بعد سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس عرصۂ مختصر میں ہی کئی اردو شعراء کی قابل قدر تصانیف کا تخلیقی عمل پورا ہوا۔ اورنگ آباد اور برہانپور اور پھر حیدرآباد کو ادبی مرکزیت حاصل ہوئی۔ اس دور کے مثنوی گو شعراء میں محمود بحری (من لگن، بھنگ نامہ) شیخ داؤد ضعیفی (ہدایت نامہ، عشق صادق وغیرہ) شاہ تراب علی تراب (قصۂ ملا) علا دل (ابلیس نامہ) حسین (قصۂ شمعون) منظفر (مہر و ماہ) سید شاہ حسین ذوقی (وصال العاشقین، غوث نامہ، وفات نامہ، منصور نامہ، ماں باپ نامہ) شاہ بیر اللہ مجرمی (گلشن حسن و دل ۱۱۴۴ھ) بلبل (چندر بدن) شاہ عبدالعلی راجی (نامۂ علی۔ ۱۱۱۰ھ) دریا (وفات نامہ ۱۱۱۱ھ) عبدالحمید ترین (شمائل النبی) وجیہہ الدین وجدی (پنچھی باچھا، تحفہ عاشقاں اور مخزن عشق) فتح شریف فتح (زلیخا ثانی) عاشق (اشارت الغافلین) سید اشرف (جنگ نامہ حیدر) میر ولی فیاض ولی ویلوری (روضۃ الشہداء، روضۃ الانوار، روضۃ العقبیٰ، رتن و پدم) سید محمد خاں عشرتی (دیپک پتنگ، چت لگن)

---

[۱] عبدالقادر سروری۔ اردو مثنوی کا ارتقاء ۹۰

سید محمد فراقی (مراۃ الحشر) شاہ عبدالرحمٰن قادری (باغ حسینی) وغیرہ کے اسمائے خاص شامل ہیں۔

قاضی محمود بحری بن بحر الدین کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے عالمگیر کی مدح بھی کی ہے۔ من لگن اور جنگ۔ نامہ یادگار رکھتے ہیں۔

جن مطلق عاشق حق　　　جن عاشق حق مطلق

جن انی انا کے راز　　　بے خودی میں دیدے ساز

ضعیفی نے اپنی مثنویوں میں ہندی لفظوں کا کثرت سے استعمال کیا۔ عشق صادق ایک فرضی قصہ پر مبنی مثنوی ہے۔ اس "نے چھوٹی چھوٹی باتوں کا اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ ان پر باوجود جھوٹ ہونے کے اصلیت کا شبہ ہوتا ہے۔" [1] جب کہ "ہدایت نامہ" میں فقہی مسئلے بیان کیے گئے ہیں۔ جو ۲۵ حصوں میں تقسیم ہے۔ مذہبی عقائد اور قوانین معجزات کا ذکر کیا گیا ہے۔

وجیہہ الدین وجدی اس دور کا صوفی منش شاعر تھا۔ انہیں خوش حالی، خوش فکری اور فارغ البالی ورثے سے ملی تھی۔ کسی امیر و رئیس کی مدح نہیں کی۔ حکمت پیشہ تھا۔ خدمت خلق سے سرشار تھے۔ انہوں نے شیخ فریدالدین

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو ص ۳۳۵

عطّار کی مثنوی "منطق الطیر" کا ترجمہ انتہائی قابلیت اور فکر و تدبّر کے ساتھ بہ نام "پنچھی باچھا" ۱۱۳۱ھ میں کیا تھا۔ دکھنی زبان کی خوبصورتی، رعنائی اور شستگی جذب کر دی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے شیخ عطّار کی ہی دوسری شعری تصنیف "گل و ہرمز" کا ترجمہ اسی قابلیت سے بنام "تحفۂ عاشقاں" ۱۱۵۳ھ میں کیا۔ یہ ترجمہ ہو بہو لفظی ترجمہ نہیں بلکہ وسعت خیالی کا عمدہ نمونہ ہے۔ وجدی نے اس میں اور بھی کئی معنوی جہتوں کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی ایک تیسری مثنوی "مخزن عشق" موسومہ "باغ جاں فزا" ہے۔ وجدی کی یہ تیسری مثنوی ان کی اپنی طبّاعی کا نتیجہ ہے۔ ۱۱۴۴ھ میں یہ خوبصورت اور دل پذیر مثنوی تخلیقیہ وجود سے ہم کنار ہوئی۔

وجدی کی ان مثنویوں میں شعری ترنّم، بیانیہ اصالت، سحر طرازی، حکمت عملی، وقوع بیانی کیا کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی ہنرمندی سے الفاظ و تراکیب اور تشبیہات کے برتاوے پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ نیز ان مثنویوں سے اس زمانے کی معاشرتی حیثیت اور سماجی و فکری رویّہ سے متعلق مفید اطلاعات بہم ہوتی ہیں۔ دراصل ایک طور سے ان کی یہ مثنویاں عصری روایات کا آئینہ ہیں۔

جب اٹھاتا ہے وہ سیمرغ نقاب
بت جھمکتا منہ ہے مثلِ آفتاب
پڑیا عکس اس نور کا جس دھن
جھلکنے لگا آرسی کے نمن

ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدار" ملّا حسین واعظ الکاشفی کی فارسی روضۃ الشہدار کا ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی رثائی مزاج کی حامل ہے جسے مجلسوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا بیان اس کا موضوع خاص تھے۔

روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ سے اس کی دینی حریت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کہنہ مشق شاعر کی کوئی مثنوی دس ہزار شعروں سے کم نہیں۔

منجملہ اس دور کی مثنویوں کی زبان بہ مقابلۂ اول زیادہ صاف اور واضح ہے۔ ہندی لفظوں کے ساتھ فارسی لفظوں کا استعمال مناسب ہے۔ اسلوب بیان میں بھی واضح تبدیلی کے اثرات نمایاں ہیں۔

دیا حق تعالیٰ نے یوں جس کو جس
جو دشمن ہوا اس رنگے خوار و خس
ضیعفی —

دیوانہ کو سیانہ کر دیکھایا
سیانے کو دیوانہ کر دیکھایا
— تراب

اری نیک اختر توں بیگی سوں جا
بولا کر اسے میرے نزدیک لا
— مظفر

دسے زخمیاں کا عکس اس میں رگت سوں
دکھایا جیوں شفق بادل منے سوں
عشرتیؔ

—

عالمگیری حکمت عملی ناکام ثابت ہوئی۔ نواب نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے آصف جاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ نواب آصف جاہ اول (۱۱۳۶ھ تا ۱۱۶۱ھ) سے نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع (۱۲۲۹ھ تا ۱۳۶۸ھ) تک ادب و شعر میں ہجریاتی تفکر اور مہاجرانہ روش کے نقوش تابندہ ہوئے اور حزن و ملال کے ساتھ نئی توقعات وابستہ ہوئیں۔

سید سراج الدین اورنگ آبادی (بوستانِ خیال) غضنفر حسین (جنگ نامہ عالم علی خاں) عارف الدین خاں عاجز (لال و گوہر) خواجہ رحمت اللہ رحمت (تنبیہہ النساء) سید عبداللہ قیاسی (طوطی نامہ) شیر محمد خاں ایمان (برق تاب) سید احمد ہنر (نیہ درپن) شاہ غلام حسین (لگن نامہ) لطف النساء بیگم امتیاز (گلشن شعراء) وغیرہ مثنویاں قابل ذکر ہیں۔ یوں عموماً اس دور کے شعراء نے "غزل" کو فوقیت دی۔ مراثی بھی لکھے۔ مثنوی کی حیثیت ضمنی ہو گئی۔

اس دور کے سب سے اہم شاعر سراجؔ اورنگ آبادی ہیں جن کے ضخیم دیوان میں بہت ساری چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ "بوستان خیال" ایک الگ تالیفی حیثیت رکھتی ہے۔ صوفیانہ فکر کی حامل یہ مثنوی حقیقت و

مجاز کا بہت عمدہ متصل نمونہ ہے۔

اس دور سے متعلق دو اور اہم شاعر نوازش علی خاں شیداؔ اور عارف الدین خاں عاجزؔ سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

شیداؔ نے دو طویل مثنویاں بہ نام روضۃ الاطہار اور اعجاز احمدی رقم کی۔ یہ دونوں طویل مثنویاں قدر و تہذیب اور مذہبی فکر کی حامل یادگار ہیں۔

عاجزؔ کی ایک قابل ذکر مثنوی قصۂ لعل و گوہر ہے جو سادہ و سلیس بیانیہ اسلوب کی حامل ہے۔

ہر یک سمت پانی کی نہروں کی سیر
وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب سے ہر طرف آبشار
جدھر دیکھیئے ہو رہی تھی بہار
ہر اک حوض پانی سے لبریز تھا
ہر اک قطرۂ باغ گل خیز تھا
ادھر بلبلوں کی غزل خوانیاں
ادھر پھول کی شبنم افشانیاں

—— بوستانِ خیال سے

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی
سخن کا لعل دے میری زباں کو — ذکرِ معنیٰ سے بھر میرے بیاں کو

— لعل و گوہر

منجملہ دکن اور اطراف دکن کی پوری شاعری حقیقت پسند اور ہند آریائی فکر کی مبلغ ہے۔ اس نقش تسلسل کو ولی نے اور تابندگی بخشی جس کی روشنی دلی کے ہر کوچہ و بازار میں کوند ابڑھ کر لپکی اور بڑھتے بڑھتے مغلیہ شان و شوکت کا باعث بنی۔ بوستان خیال کو دکنی مثنوی کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ مثنوی دکنی فکر کا شاہکار ہے۔ اس کے مرتبہ تک کم ہی مثنویاں پہنچ سکی ہیں۔

جب شمالی ہند کو سیاسی مرکزیت اور برتریت حاصل ہوئی اس وقت دلی میں حضرت امیر خسرو اور دوسرے صوفی شعراء کی شاعری مشتہر ہو چکی تھی۔ امیر خسرو (م ۱۳۲۵ء) شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۱۵۳۷ء) شیخ بہاءالدین باجن (م ۱۵۰۶ء) وغیرہ نے بہ طرز مثنوی گیت، بھجن، دوہے، کھ اور نعتیہ کلام کی تخلیق کی۔ امیر خسرو کی "خالق باری" کو بہت شہرت ملی۔

خالق باری، سرجن ہار | واحد، ایک بڑا کرتار

اسم اللہ، خدا کا ناؤں | گرما دھوپ سایہ چھاؤں

سعدی کاکوروی (۱۰۰۲ھ) افضل جھنجھانوی (۱۰۲۰) چندر بھان برہمن، مرزا عبدالقادر بیدل (۱۷۴۸ء) ملا محمد علیم تحقیق (۱۱۳۲ھ) یہ سب ولی سے مقدم ہیں۔ اور شمالی ہند میں اردو میں شعر کہتے تھے۔ جو اس زمانہ میں ہندی، ہندوی اور ریختہ کے نام سے منسوب تھی۔

افضل کی بکٹ کہانی، ہندی فضا کی مکمل اور جامع تمثیل ہے۔ مشہور و معروف یہ بارہ ماسہ مثنوی کی توسیعی شکل ہے۔ اسی لئے بکٹ کہانی کو مثنوی کی پہلی شبیہہ اور مستقل صورت قرار دینے کی سعی کی گئی۔

سیہ بادر چہار د اور چھائے | لیا مجھ گھیر پیو آجہنو نہ آئے
جھڑی پڑنے لگی اور رعد گرجا | تمامی تن بدن جیو جان لرجا

—

اسی طرح ابتدائی نقوش کے تحت روشن علی کی عاشور نامہ (۱۶۸۸ء) اسمٰعیل امروہوی (م ۱۷۱۱) کی وفات نامہ حضرت فاطمہ (سال تصنیف ۱۶۲۱ء) ولی دکنی کی "روضتہ الشہداء" اور "تعریف شہر سورت" دو مثنویاں دستیاب ہیں۔

شمالی ہند کے ابتدائی ادوار میں غزل، نعت و منقبت اور حمدیہ اشعار کو فوقیت حاصل رہی ہیں۔ مثنویاں خال خال لکھی گئیں۔ چھوٹی چھوٹی یہ مثنویاں پند و نصائح پر مبنی رہی ہیں۔ فائز، حاتم، آبرو، خان آرزو، مظہر جان جاناں، جی، یک رنگ، بیان، ذکی، فقیہہ وغیرہ کی شاعری نقش اول کی حیثیت سے لسانی خصوصیات کی حامل ہے۔ فائز کے دیوان میں ۱۴ مختصر مثنویاں ہیں جن میں تعریف پنگھٹ، تعریف ہولی، بیان میلۂ بہتہ، تعریف گوجری اور در وصف بھنگیرٹن درگاہ قطب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آبرو نے محمد شاہی دور میں کئی مثنویاں لکھیں جن میں موعظہ آرائش معشوق کو اچھی مثنوی کہا جاسکتا ہے۔ حاتم کے "دیوان زادہ" میں ۵ مثنویاں، سراپا، ساقی نامہ، وصف قہوہ، وصف تماکو وحقہ اور بزم عشرت شامل ہیں۔

ایک دیکھی میں بھنگیرٹن دل ربا | من ہرن، کنچن برن حورین لقا

فائز

کوئی ہے سانوری، کوئی ہے گوری . کوئی چمپا ہرن، عمردوں میں تھوڑی

حاتم

اسی آس پاس کے دائروی برسوں میں مولانا محمد باقر آگاہ کی "ہشت بہشت" غلام قادر شاہ کی "رمز العاشقین" اور "گلشن نامہ" فقیر اللہ آزاد کی "دُرِ مکنون" اور رحمت شاہ کی "شیریں فرہاد" کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اردو مثنوی کو دورِ متوسط میں ترقی کے زیادہ مواقع ملے۔ میر تقی میر، میر اثر اور میر حسن سرخیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ حالاں کہ سودا کو برتری کا منصب قصیدے سے ملا لیکن انہوں نے حسبِ دستور چھوٹی چھوٹی ۲۴ مثنویوں کو تخلیقی مراحل سے گزارا۔ عموماً یہ مثنویاں موضوعاتی ہیں۔ لیکن قصیدہ کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ ان کی مدحیہ مثنویوں میں تعریف شکار آصف الدولہ، تعریف بادشاہ عالم، تعریف چاہ مومن خاں تعریف اشعار قہربان خاں اور ہجویہ مماثل مثنویوں میں، ہجو پیل راجہ ترپت سنگھ، ہجو میر ضاحک، ہجو شیدی فولاد خاں ہجو حکیم غوث وغیرہ، ان کی ایک مثنوی مناظر فطرت سے متعلق بہ نام درشکایت موسم گرما اور ایک عاشقانہ بہ نام لپسر شیشہ گر قابل ذکر ہیں۔

کلیات میر میں ۳۷ مثنویاں درج ہیں۔ مگر شعلۂ شوق اور دریائے عشق کے علاوہ کسی اور مثنوی کو مقبولیت کی سند نہیں مل سکی۔ ان کی یہ عاشقانہ مثنویاں فوق الفطری عناصر سے خالی نہیں۔ ان قصّوں کا انجام المناک ہوتے ہوئے بھی اسلوبی فصاحت نے طربنا کی لوٹا دی ہے۔

اسی زمانے میں میر سوز، میر اثر (خواب وخیال) غلام قادر

ساحر (قصۂ سرو شمشاد اور طالب موہنی) عبدالولی عزلت (بارہ ماسہ ساقی نامہ اور راگ مالا) اور میر شیر علی افسوس (بہار سخن) وغیرہ نے بھی مثنویات کا دائرہ وسیع کیا۔

میر حسن کی "خواب و خیال" اپنی نوعیت کی منفرد مثنوی ہے۔ اس کے پس پردہ روایت سے انحراف کا جذبہ بھی موجود ہے۔ لگتا ہے یہ قصّہ ان کی اپنی سرگزشت کا حصّہ ہے۔ اس عشقیہ مثنوی کی یہ خوبی ہے کہ اس کے اثر و تاثیر و تاثر کا جو دبا ہوا طوفان لہریں لے رہا ہے اس کی مثال مشکل سے کسی دوسری عشقیہ مثنوی میں ملے گی۔" ؎۱

جدھر نکلے رنگیں اداؤں کے ساتھ — چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ
کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں — نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

—— شعلۂ عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — بے ستوں میں شرار تیشہ رہا

—— دریائے عشق

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا — چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا
گر کہا بھی تو کون مانے ہے — جو سنے ہے سو جھوٹ جانے ہے

—— خواب و خیال

؎۱ مجنوں گورکھپوری۔ نکات مجنوں ص ۸۷

عجائب ایک تھا رنگیں نشیمن — کہ اس کے صحن میں پھولا تھا گلشن
بچھا تھا اس میں فرش زعفرانی — کہ اوس کا حاشیہ تھا ارغوانی

—— راگ مالا

قریب دو دور اسی عہد سے متعلق دو عظیم المرتبت شاعروں کا ذکر مقصود ہے۔ میر جعفر علی خاں حسرت، میر ضمیر اور میر حسن۔ جعفر علی خاں حسرت سے تین مثنویاں بہ نام طوطی نامہ، ساقی نامہ اور، نسخۂ حکیم منسوب کی گئی ہیں۔

میر ضمیر وہ قادر الکلام شاعر تھے جنہوں نے بہ یک وقت غزل، مرثیہ، رباعی، قطعہ، سلام، قصیدہ اور مثنوی پر طبع آزمائی کی۔ شعری منطقے کا کوئی گوشہ اچھوتا نہیں رہا۔ گو کہ انہوں نے مرثیہ گو کی حیثیت سے شہرت و ناموری حاصل کی مگر مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ کمزور نہیں۔ مظہر العجائب، معراج نامہ، نسخۂ محبت اور معجزات ان کی بہترین اور کامیاب مثنویاں ہیں۔

کیجیے ایک مثنوی ارقام — معجزات علی ہوں جس میں تمام
جس میں سرتا بپا غرائب ہو — مظہر مظہر العجائب ہو
جو پڑھے اس کو ہو حصولِ ثواب — جو سنے اس کو ہو امانِ عذاب
یہ دعا حق سے ہے صبح و شام کروں — جلد یہ مثنوی تمام کروں

—— مظہر العجائب

کتابوں میں ہے جو حیات القلوب — رقم اس میں ہے حال معراج خوب
ہوئے جب کہ مامور خیر الانام — بہ حکم رسالت شہِ خاص و عام

گئے جب عرش پر رسولِ عرب
لکھا ہے سبھوں نے کہ تھا وقت شب

وہ شب لیلۃ القدر در اصل تھی
خدا و نبی کی شبِ وصل تھی

سیاہی وہ گیسوئے حور تھی
وہ شب تھی کہ نوراً علیٰ نور تھی

نبی کے جو آنے کا اقرار تھا
ستارا ہر اک چشم بیدار تھا

تھی اس شب پہ تاروں کی جلوہ گری
دولہن کے ہو جوں مانگ موتی لڑی

—— معراج نامہ

اردو زبان کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان ۱۷۸۴ء میں بزمانہ آصف الدولہ لکھی گئی۔ اس کے علاوہ ان کی اور مثنویاں ہیں۔ طویل مثنویوں میں سحر البیان، رموز العارفین اور گلزار ارم اور باقی سبھی مختصر ہیں۔ اپنی زبان دانی، سریع الاثری، تشبیہی روش اور بیانیہ شدت کے باعث سحر البیان ممتاز ہے۔ میر حسن کو منظر نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری میں کامل آگہی حاصل تھی۔

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جدی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں سب کو داؤدیوں کا کہیں

کہیں زرد نسریں، کہیں نسترن
عجب رنگ پر زعفرانی چمن

درختوں نے برگوں کے کھولے ورق
کہ لیں طوطیاں، بوستاں کا سبق

—— سحر البیان سے

جب مجازی کا نہ ہو یارد بیاں
پھر حقیقت کس طرح سے ہو عیاں

جا مجازی میں قدم پہلے تو رکھ
پھر حقیقت کا مزا اس بعد چکھ

—— رموز العارفین سے

کوئی بالے میں لے کر گل بھرے ہے　　کوئی پھول اپنا انگیا میں دھرے ہے
کوئی لالے کی پتی توڑتی ہے　　کھڑی کوئی پٹاخہ چھوڑتی ہے

—— گلزار ارم سے

میر حسن کے ہم عصروں میں قائم (م ۔ ۱۲۱۰ھ) مصحفی (م ۔ ۱۲۴۰ھ) نواب مرزا محمد تقی ہوس (لیلیٰ مجنوں) تپش (بہار دانش ۔ تصنیف ۱۲۱۵ھ) مرزا کاظم علی جواں (بارہ ماسہ) حیدری (ہفت پیکر) میر غلام علی عشرت بریلوی (ریاض الحسین) محمد حسین تجلی (لیلیٰ مجنوں) کے نام کی شمولیت لازم ہے ۔ جن میں قائم اور مصحفی کا مقام د مرتبہ اہمیت رکھتا ہے ۔

قائم نے چھوٹی بڑی پچیس مثنویاں لکھی ہیں ۔ جذب الفت یا "درویش و عروس" ۳۵۹ ۔ اشعار پر مشتمل ہے ۔ دوسری طویل مثنوی قصۂ شاہ لدّھا ہے ۔

غلام ہمدانی مصحفی بن شیخ ولی محمد امروہوی کی ۲۰ مثنویوں کے ہم ہونے کی اطلاع ملتی ہے ۔ ان میں چار مثنویاں بہتر اور لائق ذکر ہیں جذبۂ عشق، گلزار شہادت، شعلۂ شوق اور بحر المحبت کا موضوع عشق ہے ۔ "جذبۂ شوق" رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۹ میں شائع ہو چکی ہے ۔ گلزار شہادت میں ۲۶۳ شعر ہیں ۔ جب کہ بحر المحبت زیادہ طویل اور منفرد ہے

میر غلام علی عشرت بریلوی (۱۱۸۳ھ ۔ ۱۲۳۶ء) نے دو مثنویاں (بد ماوت ۱۲۱۱ھ ۔ ۱۷۹۶ء) (ریاض الحسین ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء) لکھیں ۔ جائسی کی پدماوت کا عمدہ ترجمہ ہے ۔ ریاض الحسین موسوم ہے

روضۃ الشہدا مشہور ہوئی۔ ۱۳۵۰ اشعار پر مشتمل اس مثنوی نے اپنی پاکیٔ بیان اور سلاست و روانی کے باعث امتیازی حیثیت حاصل کی۔

یہ تصنیف میری ریاض الحسین — ہو مقبول اے سرورِ مشرقین
بیاں کر نبی کے سبھی نورِ عین — رکھا نام اس کا ریاض الحسین

سبب تخلیق ملائے دین و دنیا، عبادت و اطاعت اور رضائے الٰہی ہے۔ بارہ ابواب پر مشتمل مثنوی کا آغاز آدم و حوّا کی پیدائش سے کرتے ہوئے خاتمہ آئمہ کرام کی منقبت پر کیا ہے۔ درمیان میں عشرول میں نبیوں کے واقعات، رسول کریم کے حالات خلفائے راشدین کے احوال قلم بند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان بیانات میں سے بعض بیانات کو خلاف روایات کا باعث بنیں۔ اور بعض روایات کی شمولیت سے احترام وعقیدت کی حدود شکنی ہوئی ہے۔ بہرحال یہ مثنوی چند اختلافات سے قطع نظر معینہ معیار تک پہنچ گئی ہے۔ مدح وستائش، تغزّل وقوع بیانی منظرنگاری رزم گوئی، گریہ و ماتم اور رثائی فکر نے تاثیریت بخش دی ہے۔

ہو ایمان و علم و عمل در نصیب — بہر دو جہاں عشق و منصب نصیب
کہ حق ہو مددگار میرا مدام — بہ حق محمد علیہ السلام
ائمہ کی دائم لکھوں گا ثنا — کہ دنیا و دیں میں ہیں وہ مقتدا

اسی سلسلے سے انشاء اللہ خاں انشا، شیخ قلندر بخش جرأت،

سعادت یار خاں رنگین، ہدایت اللہ ہدایت جیسے ناموں کی مثنویاں نئے مزاج والطوار کی حامل نہیں. یہ انہیں روایتوں کا نقش تسلسل ہیں جن سے مثنوی کی تاریخ بادقار بنی ہے۔ یہ شعراء اصلاً غزل کے شاعر ہیں۔ مگر حسب روایت مثنوی سے رشتہ قائم کرتے ہوئے اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔ زبان و بیان کی چاشنی و توعہ نگاری اور جذباتی تموّج اور تخیلی ادراک کی علامتیں موجود ہیں۔

عشق ہے جو ہر محیطِ جہاں ۔۔۔ عشق ہے جسم آدمی میں جاں
عشق کا کائنات کا مفہوم ۔۔۔ گر نہ ہو عشق تو ہیں سب معدوم
عشق سے آسماں ہے سر گرداں ۔۔۔ عشق سے یہ گردشِ دوراں
عشق سے ہے دوام عالم کا ۔۔۔ عشق سے ہے نظام عالم کا

مصحفی۔ "جذبۂ عشق" سے

جب جدا مجھ سا یار جانی ہو ۔۔۔ کس روش اپنی زندگانی ہو
تھاموں ہوں دم بہ دم کلیجے کو ۔۔۔ کھائے جاتا ہے غم کلیجے کو

جرأت۔ بحر الفت سے

دور آیا ہے یہ ایسا ہی کہ یار ۔۔۔ ماں کو بیٹی کا نہیں ہے اعتبار
بھائی کو مطلق نہیں بھائی سے پیار ۔۔۔ بھانجے کو بھی نہیں ماموں کی چاہ
کچھ بہن کو بھائی کی الفت نہیں ۔۔۔ باپ کی بیٹے پہ کچھ شفقت نہیں
ہے بھتیجے سے چچا کا دل فگار ۔۔۔ جان و دل سے یار کا دشمن ہے یار

رنگین۔ ایجادِ رنگین سے

مومن و غالب اور میر و انشا کے درمیانی مرحلے میں ایک ترقی پسند فکر کا حامل شاعر نظیر اکبر آبادی ہے۔ جس کے کلیات میں تین مثنویاں شامل ہیں۔ "سیر دریا" فطرت کی مصوری کا شاہ کار ہے۔ جب کہ آخری مثنوی عشقیہ رمز و حقائق پہ مبنی ہے۔ اسی زمانے میں مول چند منشی کا نام شاہ نامہ اردو، سام نامہ اور ہیر رانجھا) قطب علی بیگ فگار (یوسف زلیخا) اعظم الدین سرور (شیریں فرہاد، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں) نیاز بیگ نکہت (نل دمن) راحت کاکوروی (نگارستان راحت) وغیرہ نے تاریخی اور مذہبی مثنویاں لکھیں۔

میر و سودا سے لے کر غالب و ذوق اور مومن تک غزل اور قصیدہ کی حکمرانی رہی لیکن شعری سفر میں غزل کے ساتھ کم ہی اصناف نے رفاقت نبھائی۔ غالب نے بھی تبدیلیٔ مذاق کی خاطر ایک مثنوی "در صفت انبہ" تخلیق کی۔ ۴۳ شعروں پر مشتمل یہ مختصر سی مثنوی غالب کی مزاج رسی کا نمونہ ہے۔ البتہ مومن نے باضابطہ کئی عمدہ مثنویاں تخلیق کیں جن میں شکایت غم، قصۂ غم، قول نمیں تف آتشیں، حنین مغموم اور آہ و زاریٔ مظلوم معروف ہیں۔ یہ مثنویاں عشق اور منتہائے عشق کی روداد ہیں۔

"یہ سب کی سب قلبی واردات اور کیفیات کے نقشے ہیں۔ وہ ایک شاعر کا دل اور ساحر کی زبان رکھتے ہیں۔ عشق و محبت کے راز و نیاز سے بھی بہ خوبی آشنا تھے۔ اس لیے ان کی مثنویاں غیر معمولی اثر رکھتی ہیں۔"[1]

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو مثنوی کا ارتقاء ص ۱۳۳

خصوصی طور پر نواب محبّت خاں محبّتؔ بن نواب حافظ الملک رحمت خاں کا ذکر لازم ہے۔ قلعۂ الہ آباد میں جہاں بہت سارے علماء وفضلاء اور شاعر مقید تھے۔ محبّتؔ نے "اسرار محبت" کا تخلیقی مرحلہ یہیں سے شروع جو میر حسنؔ کی مثنوی سے کسی صورت میں کم درجہ نہیں رکھتی جو قصّۂ "سسی پنوں" کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مثنوی اس دور کی یادگار ہے۔ جب مثنوی قابل اعتنا نہیں رہی تھی۔ محبتؔ نے اس مثنوی کو الفاظ و تراکیب، روزمرّہ اور محاورات کے خوبصورت اور مناسب استعمال سے اس معیار تک پہنچا دیا ہے جہاں اعتبار زندگی پاتا ہے۔

محبت نام اور ہر دل نگیں ہے محبت سے کوئی خالی نہیں ہے

جو سمجھو ذات مطلق فی الحقیقت محبت ہے، محبت ہے محبت

محبت بوئے گُل، گُل ہے محبت محبت جز ہے اور کل ہے محبت

مرزا داغؔ نے صرف ایک مثنوی "فریاد داغ" لکھی۔ ۸۳۸ اشعار پر مشتمل مثنوی ۱۸۸۲ میں کہی جو ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔ "داغ نہایت زود گو تھے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے دو دن میں مثنوی کہی ہوگی۔" [1]

اسی ضمن میں سر عبدالقادر نے ماہ نامہ شمع آگرہ بابتہ ۱۹۲۶ء

---

[1] تمکین کاظمی۔ مقدمہ فریاد داغ ص ۳۵

میں لکھا ہے کہ "فریادِ داغ ایک مسلسل نظم یا مثنوی ہے جس میں داغ نے خود اپنی زندگی کا ایک واقعہ نظم کیا ہے۔ داغ اس قصّے کو اس سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر شعر جذبات اور وارداتِ قلبی کا نچوڑ ہے۔"

عشق تاب و توانِ عاشق ہے | شانِ عاشق نشانِ عاشق ہے
عشق نعمت ہے آدمی کے لیے | عشق جنت ہے آدمی کے لیے
عشق کا داغ غیرتِ گُل ہے | دودِ فریاد اشکِ سنبل ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھّے | یہ مری جان ہے خدا رکھّے

لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں بھی مثنوی کے رسیا موجود تھے۔ انہوں نے اس کی پذیرائی کی۔ اچھے شعراء نے اچھی مثنویاں تخلیق کیں۔

دیاشنکر نسیم، منیر شکوہ آبادی، محسن کاکوروی، مرزا شوق، امیر مینائی، امیراللہ تسلیم، احمد علی شوق قدوائی وغیرہ نے مثنوی کا دائرہ وسیع کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مظفر علی خاں اسیر (ریاض المسلمین، خلاصۃ التقویٰ، معادنامہ وغیرہ) آغا حجو شرف (شکوہ فرنگ، طلسم لکھنؤ) جگت موہن لال رواں (نقد رواں) حیرت (جنگ عشق)، میر وزیر علی صبا (شکارنامہ) واجد علی شاہ اختر (حزن اختر) جگن ناتھ خوش تر (رامائن خوش تر)، خواجہ اسد علی قلق (طلسم الفت) جوالا پرشاد برق (بہار) اقبال ورما سحر ہتگامی (دشنت وشکنتلا) وغیرہ کی مثنویاں قابل ذکر ہیں۔

امیر مینائی نے متعدد مثنویاں لکھیں لیکن نورِ تجلی اور ابرِ کرم ہی ان کی زندگی میں شائع ہو سکیں۔ نورِ تجلی میں ۳۷۴ اور ابرِ کرم میں 1012 اشعار شامل ہیں۔ نورِ تجلی پہلی بار ۱۲۹۲ھ میں تاج المطابع رام پور سے شائع ہوئی جس میں آنحضرت صلعم کی ولادت اور فضائل و معجزات کا بیان شامل ہے۔ مذہبی حکایات اور مناجات پر مبنی "ابرِ کرم" مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئی ان کے علاوہ سات اور مثنویاں (کبوتر نامہ، دربیان جشن مسند نشینی نواب کلب علی خاں جشن خلعت پوشی نواب کلب علی خاں، کارنامۂ عشرت عاشقانہ حکایت اویس قرنی، قصۂ یہودی) تخلیق کیں۔

عشق بھی کیا صاحبِ تاثیر ہے ‫ عشق بھی کیا صاحبِ تسخیر ہے
دور کو نزدیک بناتا ہے یہ ‫ نقش دوئی کا بھی مٹاتا ہے یہ
عابد و معبود میں ہے واسطہ ‫ ساجد و مسجود میں ہے واسطہ

_____ اویس قرنی سے

تسلیم کی طبع زاد مثنویوں میں نالۂ تسلیم (۱۸۵۲ء) شام غریباں (۱۲۷۹ھ) سنبلستان خیال موسم بہ صبح خنداں (تعداد اشعار۔ ۲۴۹۰) خنجر عشق (تعداد شعر ۲۱۳۰) گوہر انتخاب (۱۳۱۵ھ) تاریخ بدیع (۱۸۸۱ء) دل و جان (۱۸۹۴ء) اور غیر مطبوعہ مثنویوں میں تواریخ کامل (تعداد شعر ۳۹۰۶) سفر نامۂ خسروی (تعداد شعر ۱۳۹۴۴) نغمۂ بلبل، شوکت شاہ جہانی قابل ذکر ہیں۔

ان مثنویوں کی زبان بہت سادہ اور سہل ہے۔ بیانیہ اصالت،

حکیمانہ بصارت اور شاعرانہ صراحت نے ان مثنویوں کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔

جبیں زلفوں سے کب ہے نور افشاں ۔۔۔ قریب صبح ہے شام غریباں
کنار چشم دنبالہ کھنچا ہے ۔۔۔ لب آہو پہ یا برگ گیا ہے
حیا کچھ پاؤں پر ایسی پسی ہے ۔۔۔ اُسے جب دیکھو قدموں سے لگی ہے

——— نالۂ تسلیم سے

دبستان لکھنؤ سے متعلق شعراء میں آتش، ناسخ اور جلال کے بعض شاگردوں نے قابل ذکر مثنویاں تخلیق کی ہیں۔ خصوصاً بعض تلامذۂ آتش نے دھلی کے تقابل میں لکھنؤ کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ خواجہ ولایت علی خاں سرور (یوسف و زلیخا۔ تصنیف ۱۸۹۹ء) سید سادات حسین خاں شرف عرف حجو (طلسم لکھنؤ۔ ۱۸۷۳ء) حکیم تصدق حسین خاں نواب مرزا شوق (م ۱۸۷۱ء) میر وزیر علی ضامن بن میر بندہ علی (م۔ ۱۲۷۱ھ) اور پنڈت دیا شنکر نسیم (م ۱۸۴۴ء) قابل ذکر ہیں۔

پنڈت دیا شنکر نسیم بن گنگا پرساد کول صرف ۳۲ سال کی عمر پا کر رحلت کی۔ گلزار نسیم تحفۂ یادگار ہے۔ پہلی بار مطبع میر حسن رضوی سے ۱۸۴۴ء میں نسیم ہی کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے اور شائع ہوتے جاتے ہیں۔ اس مثنوی کو قبول عام کی سند ملی۔ انہوں نے نازک بیانی، خیال آفرینی، جدت طرازی، نقش آرائی اور معنی گری کی جو مرقع کشی کی ہے وہ ان کے فکر و ابلاغ کا مثبت اظہار ہیں۔ انہوں نے قصۂ گل بکاؤلی کو زندگی بخش دی ہے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی | پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے | کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گُل ہے کہ علاجِ نور ہے یہ | گل ہے کہ چراغ طور ہے یہ
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
منہ پھیر کے ایک مسکرائی | آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

مرزا شوق نے تین معرکتہ آرا مثنویاں فریب عشق (۱۸۴۹ء) بہار عشق (۱۸۴۹ء) اور زہر عشق (۱۸۶۲ء) تخلیق کیں جو ان کے بقائے دوام کا سبب بن گئیں۔ یہ مثنویاں اپنی رنگین بیانی، شرارت، نسائیت، عیش پسندی، بے فکری، تونگری، خوش باشی، طرفگی کا اشتہار ہیں۔ اور جس طرح مرزا شوق نے الفاظ و محاورات، روزمرہ اور تشبیہوں کا استعمال کیا ہے۔ وہ اُن کی آزادانہ روش، طرح داری اور خرمستیٔ فکر کا ثبوت ہے۔ لکھنؤ کی سماجی اور معاشرتی رویّہ کی یہ بولتی تصویریں قاری کو مدہوش رکھنے میں کامیاب ہیں۔

دن میں سو بار بام پر جانا | دیکھنا بھالنا چلے آنا
طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے | موت بہتر ہے ایسے جینے سے
زرد چہرہ ہے ارغواں کی طرح | ٹکڑے پوشاک ہے کتاں کی طرح

زہر عشق سے

آستینوں کی وہ پھنسی کرتی جسم میں وہ شباب کی پھرتی

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

—— بہار عشق سے

کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں کون ان میں ہے جو چھنال نہیں

ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ ہم سے دونی تماش بین ہیں یہ

—— فریب عشق سے

صبا نے ایک مثنوی صیدیہ لکھی ہے جسے عموماً شکارنامہ بھی کہا گیا ہے۔ دراصل یہ "مثنوی نواب محسن الدولہ نبیرۂ غازی الدین حیدر بہادر شاہ اودھ اور نواب احمد علی خاں وزیر الملک کے شکار سے متعلق ہے۔"[۱]

آتش کے ہم عصر ناسخ نے دو مثنویاں ایک بے عنوان اور دوسری سراج نظم لکھی ہے۔ مگر وہ کسی خاص تاثر کی حامل نہیں۔ البتہ ان کے شاگردوں میں مرزا حاتم علی بیگ مہر (داغ نگاہ) اور خواجہ اسد اللہ خاں قلق (طلسم الفت) کی مثنویاں دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں۔

ہر جگہ سوختہ جدھر جائے سکۂ داغِ دل بھنا لائے

بے قراریِ دل ستانے لگی اشک خوں چشم تر بہانے لگی

دردِ دل جب بہت ستاتا تھا بے تکلف زباں پہ آتا تھا

میں تو اس درد سے نہ تھی آگاہ دل کو کیا ہو گیا مرے اللہ

—— قلق طلسم الفت سے

---

[۱] دبستانِ آتش۔ شاہ عبدالسلام ص ۱۸۲

سلسلۂ ناسخ کے تحت منیر شکوہ آبادی اور محسن کاکوروی کے اسمائے گرامی لائق ذکر ہیں۔

منیر شکوہ آبادی بن سید احمد حسین تلمذ اوسط علی رشک نے متعدد مثنویاں لکھیں مگر صرف معراج المضامین (۱۸۶۹ء) اور حجاب زناں (۱۸۷۹ء) ہی ان کی تحویل میں رہ پائیں۔ شائع ہوئیں اور سرفرازی پائی۔ حجاب زناں مختصر سی مثنوی ہے جو خاص خواتین کے لیے برائے اصلاح و تربیت لکھی گئی۔

سیدھی سادھی زبان ہے اس میں سادہ سادہ کلام ہے اس میں

دوسری "معراج المضامین" ان کی وہ قابل قدر مثنوی ہے جس میں انہوں نے رسول کریم کے معجزات اور اہل بیت اطہار کے واقعات نظم کیے ہیں۔ اگر حجاب زناں سادگیٔ بیان کی مثال ہے تو معراج المضامین بلاغت فکر کی مثال ہے۔ انہوں نے ابتدا تا انتہا تناسب اسلوب باقی رکھا ہے۔

سخن جام شراب زندگانی سخن آب حیات جاودانی
سخن قرآن ایمان حقیقت سخن برہان انسان حقیقت
سخن مرغان جنت کا ترانہ سخن نقش نگین جاودانہ
سخن عیسیٰ خموشی اس کی مریم دم روح القدس گویا مجسم

پری سے بڑھ کے چھب اس کی دلاویز نگاہِ چشم قدسی سے سبک خیز

قضا جولاں، قدر فرماں، جہاں گرد　　زمین و آسمان و لامکاں گرد
سمند فکر اس کے سامنے سنگ　　فضائے وہم اس کے واسطے تنگ

محسن کاکوروی قصیدہ و نعت کے معتبر سخن ور تسلیم کیے گئے انہیں شعری مملکت میں امتیازی افتخار حاصل تھا۔ انہوں نے نعت گوئی کو مستقل فن یا مسلک کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے منصب اعلیٰ عطا کیا۔" سرزمین نعت میں اپنی جدت پسندی سے رنگ رنگ کے پھولوں کا ایک گلزار کھلا دیا ہے"[1] یہی فکر، یہی احساس، یہی جذبہ ان کی مثنویوں میں بھی موجود ہے۔ یہ دینی مثنویاں اپنی پاکیزگیٔ خیال سے ممتاز ہیں۔

محسن نے پانچ مثنویاں بہ نام صبح تجلی (۱۸۷۲ء) چراغ کعبہ (۱۸۸۴ء) شفاعت و نجات (۱۸۹۲ء) فغان محسن (۱۸۷۲ء) نگارستانِ الفت لکھیں۔ آخری دو مثنویاں ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتیں۔ ضرورتاً یا محبتاً لکھی گئیں۔ ان کی مثنویاں زبان و بیان کے اعتبار سے نہ وہ خالصتاً دلی کی اور نہ لکھنؤ کی۔ انہوں نے بہت احتیاط سے اپنا اسلوب وضع کیا۔ اور اس کی پرداختگی میں پاکیزگی، طہارت، سنجیدگی، راستی اور سادگی کی شمولیت پر زور دیا۔ استعاروں اور تشبیہوں کے استعمال میں نادرانہ رویہ کی جھلک ملتی ہے۔

---

[1] ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۵۱۷

بیضاوی صبح کا بیاں ہے تفسیر کتاب آسماں ہے
موقوف حدیثِ شب کی تصحیح رکھ دیجئے طاق پر مصابیح
صبح تجلی سے

سلسلۂ مصحفی کے تحت مظفر علی خاں اسیر بن سید مدد علی (۱۸۰۰-۱۸۸۱) امیر مینائی (۱۸۳۶-۱۹۰۰) احمد علی شوق قدوائی (۱۸۵۲-۱۹۲۵) ریاض خیر آبادی (م-۱۹۳۴) کے اسمائے نیک قابل ذکر ہیں۔ امیر اور ریاض نے مثنوی پر توجہ نہیں دی۔ البتہ "درۃ التاج" اسیر سے منسوب ہے۔ اسی طرح امیر مینائی کی دو مثنویاں "نور تجلی" اور "ابر کرم" عارفانہ رنگ کی حامل ہیں۔ البتہ احمد علی شوق قدوائی نے کئی عمدہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں ترانۂ شوق" کو بہت زیادہ شہرت ملی۔ یہ مثنوی بھی فوق الفطری عناصر سے خالی نہیں۔

دانت اس کے زرد زرد پتھر دو دو انگل دہن سے باہر

دبستان لکھنؤ سے متعلق آخری دہے کے شعراء میں امیر اللہ تسلیم (نالۂ تسلیم) علی حیدر نظم طباطبائی (ساقی نامہ شقشقیہ) مرزا محمد ہادی رسوا (لذت فنا، امید و بیم، نو بہار، جنون انتظار) جگت موہن لال رواں (نقد رواں) خلیل حسن خاں خلیل (پنجۂ نگارین) منشی گورکھ پرساد عبرت (حسن فطرت) وغیرہ کی مثنویاں نئے فکر و اعلام سے بھی ہم رشتہ ہیں۔ یہی وجہ ہے ان میں تازگیٔ خیال ہی نہیں تازگیٔ بیان بھی ہے۔

مژدہ باد ! اے مرغ نالاں پھر بہار آنے کو ہے
پھر گلستاں میں ہمارا گلِ عذار آنے کو ہے
آب باراں دور گلشن سے نحوست لے گیا
ہر شجر کو دھو گیا گردِ کدورت لے گیا
دل یہ کہتا ہے کہ چل کر سیرِ گلشن کیجیے
بلبلِ بے تاب سے کچھ بحث شیون کیجیے

—— رسوا۔ نو بہار سے

تھا ایک شہر جو تھا چار عنصروں سے بنا
وہ چار کون ؟ یہی آگ، پانی، خاک، ہوا
انہیں پہ پائے تھا ہر کام انصرام اس کا
تمام خلق میں مشہور جسم نام تھا اس کا

—— عبرت۔ حسن فطرت سے

ادھر بہار اور اطراف بہار میں بھی سخن سنجوں نے باغ مثنوی کو خوب خوب ڈھنگوں سے سجایا ہوا تھا۔ طول و مختصر قصے، تاریخی و تہذیبی واقعات، دین و ادب کے حالات، مثنوی کے وہ موضوعات تھے جنہیں باکمالوں نے سجانے سنوارنے کی ہر ممکنہ کوشش کی تھی۔ بعض اچھی اور بہت اچھی مثنویاں لکھی گئیں۔ ان سخن سنجوں میں راسخ عظیم آبادی، جوشش عظیم آبادی، مرزا بیدل، آیت اللہ جوہری، شاہ کمال، غلام علی راسخ، شیخ محمد روشن جوشش، شاد عظیم آبادی، سریر کابری اور جمیل مظہری

وغیرہ اس خطۂ علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اپنی منفرد تہذیب و معاشرت اور علمی و ادبی ورثہ کے لیے مشہور ہے۔ ہندوستان کا یہ صوبہ جس کی اپنی ایک مخصوص تاریخ ہے۔ رامائن اور مہابھارت میں اس کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ عہد بہار اور اجات شترو سے مہاویر اور گوتم بدھ تک اور پال خاندان سے بختیار خلجی تک اور پھر ۱۹۴۷ تک ایک طویل داستان ہے۔ ... ذکر و تفصیل کا موقع نہیں۔

یوں تو ساتویں صدی ہجری سے ہی ایک زبان رواج پانے لگی تھی مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱ھ/۱۲۵۲ء | ۷۸۲ھ/۱۳۴۸ء) کے کلمات اس کے گواہ ہیں۔ غرض کہ ابتدائی ادوار کی شخصیتوں میں شاہ عماد الدین عمادؔ، خواجہ غلام نقش بند سجادؔ مخدوم شاہ شمس الدین مونگیری، شاہ الفتؔ، حسین فرہادؔ، شاہ محمد ظہور الحقؔ، سید شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری، سید حمید الدین بہاری وغیرہ جیسی ذی علم اور مقتدر شخصیتوں نے نہ صرف درس و تدریس کا حق ادا کیا بلکہ دین و ادب سے متعلقہ مختلف موضوعات پر گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ بزرگوں کے ان تابندہ کارناموں سے پتہ چلتا ہے کہ بہار میں شعر و ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس خطۂ ارض پر بھی دوسرے علاقوں کی طرح شعر و سخن کا سلسلہ خانقاہوں سے شروع ہو کر رؤسا کی محفلوں تک دراز ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ یحییٰ منیری اور عمادؔ پھلواروی کے بعد قاضی عبدالغفار جواہرالاسرار تصنیف کی۔ یہ ایک منظوم رسالہ ہے جس میں مذہب و تصوّف کا عنصر غالب ہے۔ مقصود بیان اس وقت صرف مثنویات ہیں اس لیے اور گوشوں سے قطع نظر ان مثنویوں کی تلاش ہے جن کے توسط سے مثنوی کی تاریخ کا یہ حصّہ

اجاگر کیا جا سکے۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے فارسی نظم و نثر میں اجتہادی روش اختیار کی۔ ۱۰۷۱ھ میں جب وہ اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ اڑیسہ میں قیام پذیر تھے۔ شیخ سعدیؔ کی پیروی میں شعر کہنے کی ابتدا کی۔ وحدت الوجودی مسلک کی پیروی کی۔ بیدلؔ کی فارسی مثنویاں طور معرفت، محیط اعظم اور طلسم حیرت علم و ایقان کی وہ روشنیاں ہیں جنہیں قلب و نظر میں سمو لینے کی طاقت کب کس نے پائی ہے۔ وہ لوگ عظیم ہیں۔ جنہوں نے کسب نور کیا " پندرہ سال کی عمر سے اس وقت تک بیدلؔ کا مطالعہ کر رہا ہوں لیکن اس سمندر سے ایک قطرہ بھی نہیں اٹھا سکا"۔[۱]

" دنیا میں چار آدمی ایسے ہیں کہ جو شخص ان میں سے کسی ایک کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے مشکل سے رہائی پاتا ہے۔ اور وہ ہیں ابن عربی، شنکر آچاریہ، بیدلؔ اور ہیگل"[۲] بیش تر اردو کلام ضائع ہو گیا۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

بیدلؔ کے بعد کئی ایسے نام نظر آتے ہیں جنہوں نے گرمئ سخن کو باقی رکھا۔ ظہورؔ پھلواروی، غلام نقش بند سجادؔ، شاہ الفت حسین فرہادؔ، شاہ ابوالحسن فردؔ اور شاہ حبیب اللہ نصرؔ وغیرہ نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کی۔

---

۱ مکتوبات نیاز حصہ دوم ص ۱۴۳
۲ شرح ضرب کلیم یوسف سلیم چشتی۔ خیالات اقبال ص ۱۱۳

شاہ الفت حسین فریاد نے دبستان اخلاق، روضۃ المعانی، گنجینۂ عشق، طلسم الفت درد دل، اور طلسم جہاں جیسی مثنویاں تخلیق کیں۔ عموماً ان کی مثنویاں نظامی، خاقانی، فردوسی کی طبع زاد بحروں میں کی گئی ہیں۔ شیخ مہدی بخش تسلیم، سید علی محمد شاد، مولانا عبدالرؤف وحید اُن کے ممتاز شاگرد ہیں۔

خواجہ میر درد کے پیرو میاں محمد روشن جوشش ایک برہمن خاندان کے فرد تھے۔ قاضی عبدالودود نے دیوان مرتب کیا جن میں جوشش کی چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں درج ہیں۔ نقل کبوتر باز، نقل افیونی اور ہجو ٹسکاری اصلاحی مثنویاں ہیں۔

حضرت شاہ رکن الدین عشق (۱۱۰۴–۱۲۰۳) کی "یادگار عشق" اور مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق (م ۱۲۰۷) کی "زیبا" کا شمار اچھی مثنویوں میں کیا جاتا ہے۔

شاہ کمال علی کمال دیوروی (۱۱۳۰ھ/۱۷۲۰ء – ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۴ء) کی مثنوی بے عنوان پاکیزگیٔ فکر، فنی پختگی اور تازگیٔ خیال کی اچھی مثال ہے۔ انہوں نے تصوف کے مسائل کو نظم کیا اور پوری مثنوی کو ایک معنوی استعارہ بنا دیا۔

عدم واجب کا گر موجب عدم ہو — وجود حق کے تئیں معلول سمجھو
عدم واجب کا باعث وجود ہو — تو واجب ہو گیا معلول سمجھو

اسی گرد و پیش کے دوسرے شعراء میں شاہ آیت اللہ جوہری (۷ر شوال ۱۲۶۶ — رجب ۱۲۱۰ھ) شیخ غلام یحییٰ حضور عظیم آبادی (توصیف نامہ شاہ ارزاں۔ ۱۱۹۰ھ) شیخ غلام علی راسخ (۱۱۶۲–۱۲۴۰ھ)

قادر علی فگار عظیم آبادی (عشق نامہ) سعداللہ عشق (شجرۂ شاہ ارزاں) مرزا محمد رئیس بخت عرب زبیر الدین (درِ شاہوار) اور قدر بلگرامی (قضا و قدر ۱۲۷۴ھ) نے قابل قدر مثنویاں تخلیق کیں۔

جوہری کی تصنیف "گوہر جوہری" ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کو لکھی گئی۔ مثنوی کا بیشتر حصہ بحر ہزج میں ہے۔ یہ رام راجہ اور کنول دیوی کا قصہ ہے۔ بارہ ماسہ کی پوری کیفیت اسی میں موجود ہے۔

گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم	مرے جی پیچ برپا آ کرے دم
پیا بن ہے ہماری سیج سونی	ہوئے رہ رہ مجھے دکھ درد دونی
اکارت جائے ہے میری جوانی	پیا پردیس کیا یہ زندگانی
تری یوں مست ہیں آنکھیں گلابی	شرابی ہیں، شرابی ہیں، شرابی

راسخ نے ۱۹ مثنویاں [۱] لکھی ہیں۔ جن میں نو عاشقانہ، دو مدحیہ، دو منظری اور چھ تمثیلی۔ نیرنگ محبت، جذب عشق، ناز و نیاز، اعجاز عشق، حسن و عشق، کشش عشق، مکتوب عشق، گنجینۂ عشق، نور الانظار، شعلۂ عشق، معاملات عشق عمدہ معیار کی حامل مثنویاں ہیں۔ اتباع ولی میں اسلوب بیان کی صلابت پر توجہ دی۔

---

[۱] نجم الہدیٰ نے ۱۹، اختر اورینوی نے ۱۴، اور عقیل رضوی نے اختر اورینوی کی تصدیق کی ہے اور تفصیلی بحث کی ہے۔

اشعار میں موسیقانہ ارتعاش کی ضرورت محسوس کی۔ ارکان مثنوی کا لحاظ رکھا۔

حمد، نعت و منقبت اور سبب تالیف وغیرہ پر خصوصی توجہ دی۔

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے   کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

گرمیاں اس کی گھلا دیتی ہیں   سنگ کو موم بنا دیتی ہیں

——— ناز و نیاز سے

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق   شمع ایوان کبریا ہے عشق

آبِ گوہر ہے اور آتشِ سنگ   ہر جگہ اس کا اک نیا ہے رنگ

——— جذبِ عشق سے

اسی سلسلے کو نئی توانائی دینے والوں میں شاد عظیم آبادی (م ۱۳۴۵ھ)

فضل حق آزاد (ہولی) سریرکابری (شاہ نامہ ہند) ظہیر الاسلام شوق نیموی (۱۲۷۸۔ ۱۳۲۲ھ) آغا علی شمس (۱۲۳۲۔ ۱۳۱۲ھ) عبد المجید شمس (حیات و کائنات) مرتضیٰ اطہر رضوی (خور و خواب) صفیر بلگرامی (فتنۂ عشق) اور جمیل مظہری (آب و سراب) کے اسمائے قابل ذکر ہیں۔

شاد عظیم آبادی نالۂ شاد (۱۲۷۸ھ) ثمرۂ زندگی، نوید ہند (ترمیم و اضافہ کے بعد مادر ہند ۱۸۸۷ء) چشمۂ کوثر (راہ حق کے نام سے بھی شائع ہوئی) دینی و علمی اور اخلاقی و قومی موضوعات پر مبنی مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ نغمۂ جاں فزا۔ یادِ حبیب، ثمرۂ زندگی اور افغان دلکش بھی طبع زاد مثنویاں ہیں۔

فضل حق آزاد کی ہولی مقصدیت کے اعتبار سے دلچسپ

پر تاثیر اور صنائع کُل سے آراستہ ہے۔

سرورِ کابری کی "شاہ نامۂ ہند" وہ تاریخی مثنوی ہے جس کے ذریعہ انہوں نے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کو آئینہ بند کیا ہے۔ لیکن وہ تاثیریت جِلا نہیں پا سکی۔ جس سے مثنوی دلچسپ و دل پذیر نہیں بن پائی لیکن ان کی عالمانہ فکر، درک و بصیرت اور تونگری خیال کی آب و تاب کہیں کہیں ضرور چمک اٹھتی ہے۔

آغا علی شمس کی "طلعۃ الشمس" حضرت سلیمانؑ اور بلقیس سے متعلق قرآنی قصہ پر مبنی مثنوی ہے۔

صفیر بلگرامی کی ۲۶ مثنویاں دستیاب ہیں جن میں "فتنۂ عشق" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ قصہ کا تسلسل خیال و معنی کے ساتھ قائمیت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے "سراپا" کی غرض و غایت بتدریج ارتقائی مرحلے طے کر لینے میں رکاوٹ محسوس نہیں کرتی۔ روزمرہ اور خانگی محاورں کی مدد سے لب و لہجہ کا نسائی رنگ اور بھی چوکھا ہو گیا ہے۔ لیکن ابتذال و رکاکت سے مہذّب اسلوب کو نقصان پہنچا ہے۔

بالاترتیب اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

اک محتشمہ وہاں کی ساکن	اس مادرِ دہر کی تھی ہم سن
دو لختِ جگر تھے اس کے قابل	دونوں کو علوم و فضل حاصل
اک لختِ جگر کا رام تھا نام	خوش خُو تھا بہت وہ نیک انجام
دلبند دوم جو نام ور تھا	نام اس کا رحیم مشتہر تھا
ہر طرح سے دونوں من چلے تھے	آغوشِ نشاط میں پلے تھے

لاڈ و ہنڈ پلے

بھویں تنی ہوئی تلوار کی شان　　رن میں کھینچی ہوئی ارجن کی کمان
غمزے چھپ چھپ کے خبر لیں دل کی　　عشوے انداز سے کہہ دیں دل کی
مسکراہٹ وہ کہ غنچے شرمائیں　　قہقہے ایسے کہ گل کھل کھل جائیں

"ہولی" سے ـــــــ

آنکھیں جادو بھری شکار افگن　　وضع بانکی بھری ہوئی چتون
رنگ سرخ و سپید شکل گلاب　　بھولا پن چہرے پر نمودِ شباب
ذہن عالی تھا اور طبیعت شوخ　　فتنہ انگیز اور قیامت شوخ

فتنۂ عشق سے ـــــــ

شوق کی مثنوی سوز و گداز کا دوسرا نام "حسن و شام سندر" بھی ہے۔ انہوں نے ایک اور مثنوی "نغمۂ راز" (۱۳۰۳ھ) بھی لکھی تھی۔ لیکن "سوز و گداز" کو زیادہ شہرت ملی۔ شوق کثیر التصانیف تھے۔ قادر الکلامی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ مثنوی عاشقانہ ہے۔ ہجر و فراق، وصل و ملاقات درد و غم، عیش و آرام، کیف و نشاط سے مل کر مثنوی کو تاثیریت، تڑپ اور قربت بخش دی ہے۔

طبیعت میں جو آجائے روانی　　دکھادوں جوشِ دریائے معانی
کرے کلک آج وہ گوہر فشانی　　کہ ہوں دُرِّ عدن بھی پانی پانی
کہوں افسانۂ عشق جنوں خیز　　سناؤں داستانِ حیرت انگیز
عظیم آباد میں اک نوجواں تھا　　ریاضِ حسن سروِ رواں تھا
نہ تھا آگاہ جورِ آسماں سے　　نہ واقف لذّتِ دردِ نہاں سے

نظر آیا یکایک شورِ محشر — پڑی آنکھ اک بُت کافر ادا پر
پری وش، ماہ سیما، مہر طلعت — بلا قامت، قیامت، قہر، آفت
بلائے جاں قیامت خیز رفتار — صدائے صور تھی چھاگل کی جھنکار
پریشاں ہو گیا گیسو کی صورت — زمیں پر گر پڑا آنسو کی صورت

مرتضیٰ اطہر رضوی اور شمس عظیم آبادی کی مثنویاں اس لحاظ سے عمدہ ہیں کہ ان میں پیش افتادہ موضوع کی پیوندکاری نہیں بلکہ عصر جدید کی نئی روشنی موجود ہے۔ "حیات و کائنات" کی تخلیق میں "آب و سراب" کی تحریک شامل ہے۔ شمس صاحب نے حیات و کائنات (۱۹۶۵ء) کے بعد "جلوۂ صد رنگ" (۱۹۷۰ء) اور "یادِ وطن" (۱۹۸۰ء) کو تخلیقی عمل سے گزار کر ان کی باطنیت کو اجال دیا تھا۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کئی اور مثنویاں "بزم و رزم فطرت" میں شامل ہیں۔ علم جغرافیہ میں درس و تدریس نے انہیں اپنی زمین سے اور کائنات کے اسرار و رموز سے قریب سے قریب تر کرنے میں معاونت کی۔" اپنے اکتساب علم و دانش کی ہمہ گیر وسعتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے شمس صاحب نے کارزارِ ہستی کو شروع سے لے کر حالیہ مراحل تک بڑے فنکارانہ سلیقے سے خاصی شعریت کے ساتھ پیش کیا ہے۔" [۱]

---

[۱] رام پرکاش راہی۔ حیات و کائنات کا مثنوی نگار شمس عظیم آبادی آجکل اکتوبر ۱۹۹۲ ص۲۱

ہے رازِ عروج و کامرانی انسان کی کشاکشِ دوامی
جاری ہے ڈوبنا ابھرنا ہستی کا بگڑ کے پھر سنورنا

——— حیات و کائنات سے

کہیں ہے نشیب اور کہیں ہے فراز کہیں آبِ گنگا کا دستِ دراز
ہوا حسنِ فطرت کا دیوانہ دل چراغِ حقیقت کا پروانہ دل

——— جلوۂ صد رنگ سے

رضوی کی مثنوی "خورد و خواب" موضوعی اعتبار سے "آب و سراب" کے تقابل میں بہت مختلف ہے۔ دو سمتوں کا فرق ان دونوں مثنویوں کا امتیاز ہے۔ "آب و سراب" کا کلیدی تصوّر تشنگی اور بیداری ہے جب کہ خورد و خواب کا کلیدی تصوّر گرسنگی اور خوابیدگی ہے۔ آب و سراب میں شعور کو قدیم مانا گیا ہے۔ جب کہ خورد و خواب میں مادّے کو" [1]

علامہ جمیل مظہری کی "آب و سراب" عصری میلان کی نمائندہ اور فکری و ذہنی ارتقاء کا اعلامیہ بھی۔ شمس اور رضوی کی بالغ نظری نے آب و سراب سے کسب نور کیا۔ عمدہ بہت عمدہ قیمتی مثنویاں تخلیق کیں۔ آب و سراب یقینی طور پر "بہ یک وقت مثنوی بھی ہے اور عصری ذہن بھی۔" علامہ نے اپنی اس مایۂ ناز مثنوی سے نئی نسل کی ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر محمد ابراہیم۔ اردو مثنوی کا سفر ص ۱۸۸

ابراہیم صاحب نے آب و سراب کے تعلق سے اچھی بحث کی ہے اور آگے کی بحث کے لیے دروازے کھلے چھوڑ دیے ہیں۔ اس وقت موقعہ نہیں مجھے اختصار ملحوظ ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کا سلسلہ طلبہ و طالبات کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر شروع کیا گیا ہے۔ بحث کی زیادہ گنجائش نہیں۔ علامہ کی "آب و سراب" سے اور رضوی کی "خورد خواب" سے اقتباسات درج کرتا ہوں۔

پائے جو فلک نے گوشوارے　　بخشے گئے کہکشاں کے تارے
جوہر کو عرض، عرض کو جوہر　　گوہر کو صدف، صدف کو گوہر
ابرو کو کجی، کجی کو ابرو　　جادو کو نظر، نظر کو جادو
کوثر کو عطا ہوئی روانی　　طوبیٰ کو ملا لباس دھانی
آندھی بے وجہ چل رہی ہے　　ندی ناحق اُبل رہی ہے
اوہام کا سبز باغ لایا　　اندھوں کے لیے چراغ لایا

—— آب و سراب سے

ایک اقتباس "جہنم سے" اس مثنوی میں بھی وہی فکری و ذہنی رچاؤ، جذبہ کی تمازت اور خیال پردازی

جو نیرو ہو، نادر ہو چنگیز ہو　　ہلاکو سے بھی دو قدم تیز ہو

—

محلّے میں میرے موذن ہے ایک　　بہت پاک باطن بہت دل کا نیک
اسے نیک پا کر ستاتے ہیں لوگ　　مذاق اس کا ہر دم اڑاتے ہیں لوگ
مگر وہ ہمیشہ بہ وقتِ نماز　　بہ صد عجز و الحاح و سوز و گداز

دعا مانگتا ہے ہر اک کے لیے   اگرچہ ہیں ظلم اس پہ سب نے کیے

"خورو خواب" سے ایک اقتباس

بکھری ہوئی دھجّیاں خبر کی   الجھی ہوئی گتھیاں نظر کی

افلاس سا فلسفوں پہ طاری   ادیان میں انحطاط جاری

حکمت کی فضا میں بے یقینی   ہوتی ہوئی کور، دور بینی

الجھی ہوئی زلف آگہی کی   اکھڑی ہوئی سانس آدمی کی

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے اردو شاعری کے نئے تیور دکھائی دینے لگے۔ قصائد اور مثنویات ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔ غزل کے ساتھ نظم نے بھی کروٹ لی۔ نظمیہ پیکر میں مثنویات کی بو باس سمٹنے لگی۔ اکثر شعراء نے نظم کی مختلف ہیئتوں میں مثنوی کو نئے لباس کے ساتھ آراستہ کیا۔ مثنویاں نئے خیالات کا اظہار بنیں۔ نئے اور جدید استعاروں میں مثنوی کا رنگ و روپ پیش کر کے تقابل میں بہت مختلف دکھائی دیا۔ اس اختلاف یا تغیر یا تبدیلی سے مثنوی کو نئی زندگی ملی

غدر سے لے کر جنگ عظیم تک اور جنگ عظیم سے لے کر ۱۹۴۷ تک ہندوستان میں جو سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی تبدیلی آئی وہ خارجی بھی ہے اور داخلی بھی۔ سائنس کی تیکنیک اور یورپی فلسفے نے سوچنے سمجھنے کا نیا انداز دیا۔ صنعتی سماج کی بنیاد پڑی۔ اس عرصہ

خیال میں جس نوع کی شاعری اُگی یا اُبھائی گئی وہ بہت انوکھی، نئی، معنی خیز اور تغیر پذیر حالات کی عکاسی تھی اس دور کے بعض شعراء نے مثنوی کو بھی نئے موسم کے نئے ذائقہ سے روشناس کرایا۔

حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ، اسمٰعیل میرٹھی، اقبالؔ، نادرؔ کاکوروی اور حفیظؔ جالندھری نے مثنوی کی ہیئت کو مختلف موضوعات کے تحت تنظیمیہ پیکر کے ساتھ استعمال کیا۔ لیکن انہیں کے ساتھ بے نظیر شاہ، کشن پرساد شادؔ، طوطا رام شایاںؔ، پنڈت دتا تریہ کیفیؔ، سرور جہان آبادی، منشی ارتضیٰ علی شررؔ کاکوروی، جوالہ پرساد برقؔ، جگرؔ بریلوی، منورؔ لکھنوی وغیرہ نے مثنوی کی ہیئت اور ارکان کی پاسداری میں کئی اچھی مثنویاں تخلیق کیں لیکن نئے استعاروں سے چشم پوشی نہیں کی۔

اس سلسلے سے یوسف علی شاہ متعان، شمس السلام کیتھلی، عبدالرحمٰن حیرتؔ، میر مہدی حسن احسنؔ لکھنوی، فیض الحسن، سید محمد رضی علی، حکیم جعفر علی بیمارؔ، منشی انوار احمد تسلیم سہسوانی، ہوشؔ لکھنوی، سید ولایت علی فردوسؔ، قدیم طرز کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنے پیش روؤں کے تتبع میں مثنویاں لکھیں۔

جنگِ عشق ۱۸۷۰ء (حیرتؔ) صبح امید ۱۸۹۲ء (فیض الحسن) ثمر عشق ۱۹۳۰ء (سید محمد رضی عالیؔ) جذبِ عشق ۱۳۰۸ھ (احسنؔ) نذر جعفری ۱۳۰۶ھ (بیمارؔ) دختر سحر (ہوشؔ) ترانۂ شوق (فردوسؔ) یہ سب عشقیہ داستانوں پر مبنی مثنویاں ہیں۔

حالی نے وقت اور اس کی رفتار کا اندازہ بروقت کیا تھا۔
قومی، ملکی، تہذیبی، اخلاقی اور عمرانی موضوعات میں اردو شاعری کے
دامن کو وسیع کیا۔ نظم کے احیار میں خصوصی دلچسپی لی۔ چپ کی داد،
بیوہ کی مناجات، برکھا رت اور حبِّ وطن نظمیاتی مثنویاں ہیں۔
"حبِّ وطن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے ۔۔۔ قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو ۔۔۔ قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد ۔۔۔ شہر ہیں اتفاق سے آباد

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی ۔۔۔ اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

اعتماد ویقین

شبلی (م-۱۹۱۴ء) کی "صبح امید" اعتماد ویقین کا وہ درجہ رکھتی ہے جس سے ولولے اور حوصلے زندگی کی مثال بن جاتے ہیں۔
مثنوی کا یہ وہی نیا استعارہ ہے جس کی روشنی کا نام "صبح امید" ہے۔

ہیں چرخ کی اب نئی ادائیں ۔۔۔ چلنے لگیں اور ہی ہوائیں
سیارے ہیں اب نئی چمک کے ۔۔۔ وہ ٹھاٹھ بدل گئے فلک کے

آزاد کی ادبی و اصلاحی تحریک کے اثرات ان کی نظموں میں روشن و تابندہ ہیں۔ وہ روشنی جو ہمیں تاریخی شعور کی نشاندہی،

کراتی ہیں۔ موسم زمستاں، شبِ قدر وغیرہ اس کی مثال ہیں۔

وہ نورِ مہر جس سے زمانے میں نور ہے | وہ نور ذرہ ذرہ میں جس کا ظہور ہے
حُبِّ وطن ہے جلوہ ہے اسی نورِ پاک کا | اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

اقبالؔ کی اجتہادی روش نے نظمیہ فکر کو نئے معنی و مفہوم دیے۔ جس کی بدولت نئی آواز سنائی دی۔ انقلابی رجحان، فلسفۂ حیات اور سیاسی محرکات کی بازیافت ہوئی۔ اقبال نے عموماً فارسی میں مثنویاں کہیں۔ اردو میں "گورستان شاہی" والدہ مرحومہ کی یاد میں اور "ساقی نامہ" کو نظمیاتی مثنویاں کہا جانا مناسب ہے ساقی نامہ کا اسلوب سادہ اور اجمالی ہے۔ فعولن فعولن فعولن فعَل کی بحر میں ایک بڑی فکر کو سیالہ مراحل سے گزار کر بیان کا جادو جگا دیا ہے۔ اقبالؔ اس منضبط صنف مثنوی کے حوالے سے اپنے فلسفیانہ افکار بیان کیے ہیں۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار | ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن | شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور | ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

زمانے کے انداز بدلے گئے | نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ | کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے | زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دور سرمایہ داری گیا ۔ تماشہ دکھا کر مداری گیا

تمدّن، تصوف، شریعت کلام ۔ بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔ یہ اُمت روایات میں کھو گئی

فریب نظر ہے سکون و ثبات ۔ تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ۔ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
سفر اس کا انجام و آغاز ہے ۔ یہی اس کی تقویم کا راز ہے

حالی کی طرح اسمٰعیل نے بھی ایسی مثنویاں لکھیں جن کا مقصود اصلاح معاشرہ اور تعلیمی ہے۔ خصوصاً انھوں نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانی ٹائپ مثنویاں لکھیں۔ خدا کی تعریف، ہماری گائے، ننھے منّے تارو، برسات کا موسم وغیرہ وغیرہ۔

حفیظ جالندھری کی شعری فکر میں سیاست و سماج اور وطنی عناصر کی علامات موجود ہیں۔ ان کی مایۂ ناز مثنوی "شاہنامہ اسلام" اردو کی وہ طویل مثنوی ہے جس میں اسلامی تاریخ کے روشن حقائق اور نشیب و فراز کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

بے نظیر شاہ کی دو طویل مثنویاں شائع ہوئیں "الکلام" یا "جواہر بے نظیر" ڈیمائی سائز کے ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ وہ تمثیلی مثنوی ہے جس میں تصوف کے مسائل نظم کیے گئے ہیں۔ جب کہ کتاب مبین "عشقیہ قصہ" کے تحت مجاز و حقیقت کی پردہ کشائی کی سعی کی گئی ہے۔ یہ پہلی مثنوی کے تقابل میں زیادہ طویل اور مبسوط موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ ڈیمائی سائز کے ۳۰۶ صفحات پر مشتمل مطبع نول کشور سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

کشن پرساد شاد کی "جلوۂ کرشن" قدیم معیار کی حامل مثنوی ہے۔ لیکن دلچسپ اور موضوعی مقصد کے بیان میں کامیاب ہے۔

پنڈت کیفی کی مشہور مثنوی "جگ بیتی" ایک ایسی مثنوی ہے جس کی ہر فصل نئی ہے۔

ہر فصل کی ہے بحر الگ اس سے ہے مقصود   بے لطفی یک آہنگی کی ہو نظم سے مفقود

"جگ بیتی" پہلی بار ۱۳۵۵ھ میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوئی۔ ۱۸×۲۲ کے سائز کے ۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ فصل ۱۸ کی تمہید ملاحظہ ہو۔

اک رات غضب کی تھی اندھیری   دنیا بنی کان کوئلے کی
جانے کس ڈر سے چاند تارے   پیچھے بادل کے چھپ گئے تھے
پو پھٹنے کی آتی تھی نہ باری   واللیل کا تھا وظیفہ جاری

اقبال ورما سحر ہنگامی نے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ بعنوان نیرنگ سحر کیا۔ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔

منور لکھنوی نے کالی داس کی دوسری تصنیف "کمار سمبھو" کا ترجمہ کیا۔ ترجمہ بے حد شستہ، رواں دواں ہے۔ شیام موہن لال جگر بریلوی (پ یکم جنوری ۱۸۹۰ء) تلمیذ عزیز لکھنوی کثیر التصانیف تھے۔ مثنوی سے متعلق دو کتابیں۔ اوّل رنگ و بو ہے جس میں تین چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ۱۔ پریم کہانی ۲۔ کرشن سداما ۳۔ بسنتی روداد۔ ۱۹۵۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ دوم۔ پیام ساوتری ۱۴۰۰ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی دانش محل لکھنؤ نے ۱۹۵۴ء میں شائع کی۔ رنگ و بو سے ان کی قادر الکلامی اور صوفیانہ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات کی عمدہ عکاسی ملتی ہے پیام ساوتری، پتی ورتا عورت کی موثر روداد ہے۔

ڈھاک میں اتنا نمو کا جوش ہے سر سے پا تک سرخ ہے گل پوش ہے
سرسوں پھولی ہے بسنتی ہے زمیں منظرِ رنگیں ہے کتنا دل نشیں

—— "بسنتی روداد" سے

راس ہر چند اسے حیات نہ تھی موت بھی اپنے بس کی بات نہ تھی
ہر نفس پر جو ہو لہو پینا ایسی مجبوریوں کا کیا کہنا

—— "پریم کہانی" سے

پنہاں ہے یقیں میں قوتِ روح ہے جوشِ عمل مسرتِ روح
ہم رازِ یقین ہے لطفِ باری دم سازِ عمل ہے کامگاری

—— پیام ساوتری سے

اور پھر ۱۹۴۷ کے بعد اردو شاعری میں کئی نئی آوازیں اُبھر کر سامنے

آئیں جو آگے چل کر بہت معتبر اور پختہ ثابت ہوئیں۔ اردو شعراء نے ملک کی سیاسی و معاشی اور قومی معاملات و مسائل میں دلچسپی لی بلکہ ادب و سماج کے باہمی رشتوں کو مضبوط کیا۔ سماجیات اور اخلاقیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ جوش، سردار جعفری، کیفی اعظمی کے ساتھ ساتھ جگر مراد آبادی، سائل دہلوی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، عامر عثمانی اور سکندر علی وجد وغیرہ نے نظمیہ پیکروں کے ساتھ مثنوی یا مثنویاں تخلیق کیں جن میں عموماً دو داد عصر موجود ہے۔

سائل دہلوی (۱۸۶۷-۱۹۴۵) نے نور جہاں اور جہانگیر کی لافانی محبتوں کو موضوع بنایا۔ جگر مراد آبادی کے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" میں ایک مثنوی عرفان خودی المعروف بہ سرور حقیقت موجود ہے یہ عارفانہ نوعیت کی مثنوی ہے۔ اس میں ایک خاص طرح کی متانت اور فکر کا استحکام موجود ہے۔ یہ موجودگی قلب و نظر کی آزمائش بھی ہے اور اس کی صراحت بھی۔

میرا نام عشیر کوئی محرم	سب مجھ میں بسا ہے کائنات عالم
غنچوں میں نہاں ہیں میرے اسرار	پھولوں میں عیاں ہیں میرے انوار
ہر بام ہے کوہِ طور میرا	عالم پہ محیط نور میرا

عامر عثمانی نے شاہنامہ "اسلام جدید" لکھا۔ "اصل مثنوی" وصال پیغمبر صلعم" کے عنوان سے شروع ہوتی ہے۔ زور بیان، فصاحت اور جزالت کے اعتبار سے یہ مثنوی کم گراں مایہ نہیں۔ [۱]

سکندر علی وجد نے کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی ہیں۔ حیات و کائنات کا مطالعہ

---

[۱] نجم الہدیٰ۔ مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں ص ۱۲۴

اور تجربات و مشاہدات کی بہت موثر تصویریں بنائی ہیں۔ منظری نوشتے دامنِ دل کھینچنے میں کامیاب ہیں۔

آنگن میں تپیاں تھے برف پارے | رقصاں تھے زمیں پر ستارے
دیواروں پہ کھڑکیوں پہ جگنو | دالان میں، سیڑھیوں پہ جگنو
پیپل تو چنار بن رہا تھا | ہر شاخ سے نور چھن رہا تھا

"جگنوؤں کی بارش" سے

علّامہ سیماب نے اپنی فکرِ رسا اور جودتِ طبع کے جو نقوش نظم و نثر کی صورت میں چھوڑے ہیں وہ ان کی جدّت و ذہانت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ نظم و غزل میں وطنیت اور انسانیات کے جذبوں کی ہم رشتگی سے ظاہر و فاخر خیالات کی عکاسی کی۔ سیاسی نظموں کا رزمیائی آہنگ طاقت کی علامت ہے "مثنوی الہام" یادگار ہے۔

جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور سردار جعفری وغیرہ نے داخلی قوتوں اور خارجی عوامل کے رشتوں میں نئی مضبوطی، نئی قوت اور نئی جسارت پیدا کی۔ یونہی وا دنیا اور غیر اخلاقی رسم و رواج کے خلاف منظم جد و جہد کی صورت نکالی گئی۔ تاکہ "انسانی ماحول کا مکمل خاکہ سامنے آسکے۔" ؎۱

جوش کی شعری نوشتوں میں ڈرامائی حسن، ماجرا بندی، رنگ آمیزی اور منظری زاویے موجود ہیں جنہیں مثبت نظریہ کے ساتھ سمیٹ لینے پر "حقیقت" بول اٹھتی ہے۔ افشائے راز، جنگل کی شہزادی، جمنا کے کنارے اور پہلی مفارقت انہیں زاویوں سے منسوب ہیں۔

؎۱ ڈاکٹر عبدالعلیم ۔ نیا ادب ۔ جنوری فروری ۱۹۴۲ء

خورشید طلوع ہو رہا ہے — افسانہ شروع ہو رہا ہے
مکھڑوں پہ لیے بہ صد تجلّی — شبنم کی نمی صبا کی خنکی
لائی ہے نسیم بوئے گیسو — کلیوں میں مچل رہی ہے خوشبو

——— "جمنا کے کنارے" سے

سردار جعفری، کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر کی جمہور، خانہ جنگی اور امن نامہ قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا پس منظر سیاسی ہے۔ سیاست و ریاست یا حکومت کے رشتوں کے تعلق سے معقول اور مدلّل بحث ملتی ہے۔

دسمبر ۱۹۴۶ کی تخلیق "جمہور" مجموعہ کلام "نئی دنیا کو سلام" شامل ہے۔ تین حصص میں یہ مثنوی جعفری کی سیاسی کاوشوں کا عمدہ نچوڑ ہے۔ حرف اوّل، جمہور اور جمہور کا اعلان نامہ کہ انہیں تین اجزاء کے توسط سے شہنشاہیت کے خلاف عوامی قسمت عملی کی مدد لیتے ہوئے مفلسی، قحط و بیماری، دولت کی نا روا تقسیم اور ظلم پر کراری ضربیں لگائی ہیں۔ مضبوط اور جابر ہاتھوں نے استحصال کے جو ہتھکنڈے استعمال کیے ان کو توڑ دینے کی سفارش کی۔ مایوسی اور کم ہمتی ترک کر دینے کی تلقین کی۔

ہماری زمیں جتنی زرخیز ہے — وبا قحط کی اتنی ہی تیز ہے
جسے دیکھو مفلس ہے کنگال ہے — ہر اک شہر، ہر گاؤں بنگال ہے
ٹپکتا ہے جبڑوں سے جن کے لہو — بدلتی نہیں ہے کبھی ان کی خو
نہ جانے ہمیں آئے گا کب یقیں — کہ شعلوں سے شبنم ٹپکتی نہیں
اتارا نہیں توڑا جاتا ہے تاج — کہ مرتا نہیں خود بہ خود سامراج

اسی فکر و احساس پر مبنی کیفی اعظمی (اطہر حسین) کی "خانہ جنگی ستمبر ۱۹۴۶
کی وہ تخلیق ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "آخرِ شب" میں شامل ہے۔ اس مثنوی کا
پس منظر ہندوستان کی تقسیم ہے۔ فرنگی سیاست جاتے جاتے انسانوں کو ہی نہیں
زمین کا بھی بٹوارہ کر گئی۔ یہ زخم ایسا نہیں تھا کہ بھر جاتا۔ سچا آدمی، آدمی کا غم،
سہہ سکتا ہے اس کے زخموں کا اندمال ممکن ہے مگر زمین کا دکھ دائمی ہے۔ زمین
کا زخم کبھی نہیں بھرتا۔ وہ سچا آدمی زمین کے اس دکھ کو سہہ نہیں سکتا۔ اس کا
احساس ہونٹوں پر، پھر قلم میں، پھر کاغذ پر اتر آتا ہے۔ "خانہ جنگی" کا طوارِ بیان
تاثراتی ہے۔ یہ مثنوی ہندو مسلمان دونوں کو تقسیم کے بد ترعوامات کا ادراک
کراتی ہے۔ گزشتہ شرمناک کارناموں کو یاد دلاتی ہے زمین کی چھاتی سے رستے لہو
تراشیدہ ریشمی آنچلوں اور معصوموں کی روتی کلکاریوں کی طرف دیکھنے کی
اور اس سے سبق سیکھنے کی تلقین کرتی ہے یہ مثنوی احتسابیہ فکر بھی رکھتی ہے
کیفی کی مہیا تصویروں سے عصرِ موجود کے انسانوں میں خود احتسابی کا جذبہ
زندہ ہو جائے۔ جسم آئینہ بن جائے تو اس زمین کا دکھ کم ہو سکتا ہے۔
امن و امان کے پھول کھل سکتے ہیں دوستی کی شبنم مہک سکتی ہے یہ زمین و آسمان
کسی خاص شخص یا فرقہ کے لیے نہیں، سب کی ہے۔ انہیں دکھ نہ دیں، عزت دیں،
پیار دیں، محبت دیں۔

خون کے ایک ایک قطرے کا — تم نے اپنوں سے لے لیا بدلہ
مندروں کی زمینیں دہلا دیں — قصر کے ساتھ مسجدیں ڈھا دیں
وقت بدلا بدل گئی دنیا — تپ کے سانچے میں ڈھل گئی دنیا

اور یہاں ہے ابھی وہی رفتار باہمی رنگ، باہمی پیکار

جاں نثار اختر کی "امن نامہ" ۱۹۵۲ء کی وہ تخلیق ہے جس کے ذریعہ یک جہتی، محبت، دوستی اور اخوت باہمی کا پیام دیا۔ اس مثنوی کا ہر شعر ان کی فنکارانہ محنت، خلوص اور نیک نیتی کا مظہر ہے ابتداً انہوں نے جنگ اور اس کے ہولناک نتائج اور جنگ کے اس خوفناک چہرے سے نقاب ہٹا دی ہے اور اس کے دوررس نتائج سے صلح پسند عوام کو خبردار کیا۔ جنگ کی ہولناکی کی تصویر ملاحظہ ہو۔

یہ ناگن سیہ پھن اٹھائے ہوئے | یہ ڈائن کلیجہ چھپائے ہوئے
یہ سرمایہ داروں کی پالی ہوئی | سدا شہریاروں کی پالی ہوئی
بھیانک ہنسی کھوکھلی سی نظر | کھڑی سرد لاشوں کے انبار پر

"امن نامہ" کے علاوہ ساقی نامہ اور پانچ تصویریں بھی اسی فکر و احساس سے وابستہ مثنویاں ہیں۔ ساقی نامہ ۴۸ اشعار کے دو بندوں پر مشتمل ہے۔ مارکسی فکر سے آراستہ اس مثنوی میں "مادیت" پر زور دیتے ہوئے عینیت و حقیقت کو محض ایک طلسم فریب قرار دیا ہے۔

مٹا دو طلسم فریب خیال | تصور کا ٹوٹا وہ رنگین جال
جہاں مادی ارتقاء کی نمود | یہ صدیوں سے تعمیر پاتا وجود
نہاں مادے میں تحرک کے شرار | ازل سے مسلسل ہیں سرگرم کار

پانچ تصویریں مارکس کی تعلیمات و نظریات کا البم ہے۔ اس میں انہوں نے معاشی، اقتصادی اور سیاسی مساوات کی نظریاتی زاویں

کو اجاگر کیا ہے۔ ۲۰-۲۰ اشعار کے پانچ بندوں پر فکر و احساس کے پوٹریٹ تیار کئے ہیں۔

پہلی تصویر :

وہ دشت، جبل، وادی و کوہسار — وہ فطرت کے سنگین نقش و نگار
وہ تاروں کے نغمے سمندر کے راگ — ہوا سے بھڑکتی نیستاں میں آگ

دوسری تصویر :

وہ میدان، ٹیلے، ندی، جھیل، ریت — وہ کھلیان، اوسر، چراگاہ کھیت
وہ کھیتوں میں سائے اترتے ہوئے — زمیں سے اندھیرے ابھرتے ہوئے

تیسری تصویر :

وہ راتوں کو عشرت کدوں کی بہار — وہ دلبر حسینوں کے سولہ سنگار
وہ فنکار رقاصۂ خوش ادا — وہ چھم چھم چھما چھم کی آتی صدا

چوتھی تصویر :

گرجتے ہوئے کارخانوں کا شور — وہ لوہے کی قوت وہ بجلی کا زور
وہ محنت کشوں کے نکلتے جلوس — ابھرتے، امنڈتے، ابلتے جلوس

پانچویں تصویر :

غلامی سے آزاد خوش دل عوام   بناتے نیا زندگی کا نظام
نکھرتا وہ انسانیت کا جمال   زمیں آپ ہوتی درخشندہ حال

غرض کہ اس مثنوی کے سفر میں انگنت اور بھی مقام ہوں گے جہاں رخشِ قلم نہیں ٹھہرا۔ کیوں نہیں ٹھہرا؟ کس لیے نہیں ٹھہرا؟ اس کی وضاحت طوالت کا باعث ہوگی۔ اختصار ملحوظ ہے۔ آئندہ حسب توفیق تلافی کروں گا۔ نہ بھی کروں تو کوئی فرق نہیں بہت بہتر اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں یا مقالے موجود ہیں۔ میں تو طالب علم ہوں۔ علم کی پیاس جہاں تک لے جاتی ہے جاتا ہوں۔ پیاس بجھاتا ہوں۔ نہیں بجھا پاتا۔ یہی کم مائگی شرمندہ کرتی ہے۔ لیکن یہی شرمندگی کسی اور سمت پہنچا دیتی ہے۔ خدا کرے یہ شرمندگی باقی رہے۔ اور میں اسے مٹانے ختم کرنے کی سبیلیں تلاشتا رہوں۔

ہاں وہ لوگ شکر گزاری کے مستحق ہیں جنہوں نے مثنوی کو عہد بہ عہد سمت سازی کا کام کیا۔ اور اس کی باطنیہ اصالت، تیکنیک اور موضوع کو نئے امکانی زاویے دیئے۔



